شیخ برکت علی اینڈ سنز کراچی

طوفان

اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک اچھوتا ناول

رئیس احمد جعفری

نفیس اکیڈمی
بلاسس اسٹریٹ کراچی
قیمت:-

جملہ حقوق دائمی
بحق چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری
مالک نفیس اکیڈیمی ۔ کراچی محفوظ ہیں ۔

طبع اوّل ———— ۱۹۴۵ء

طبع دوم ———— ۱۹۴۷ء

طبع سوم ———— ۱۹۵۲ء

طبع چہارم ———— ۱۹۵۵ء

مطبوعہ
ٹائمز پریس کراچی

مسرّت ———— زندگی کا دوسرا نام

مسرّت کی تمنّا ———— مستقل غم

جگرؔ (مُرادآبادی)

عنوانات

طوفان ـــــ چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری ـــ ۷

یہ ناول ـــــ رئیس احمد جعفری ـــــ ۸

۱ عجیب میزبان ۔۔۔ ۹
۲ بُت کدہ ۔۔۔ ۱۳
۳ جلوۂ بے محابا ۔۔۔ ۱۸
۴ وہ رات ۔۔۔ ۲۴
۵ عالمِ خیال ۔۔۔ ۳۲
۶ شکوہ و شکایت ۔۔۔ ۳۶
۷ داستانِ شب ۔۔۔ ۴۵
۸ سلسلہ جنبانی ۔۔۔ ۵۲
۹ ادھوری کہانی ۔۔۔ ۶۱
۱۰ میاں بیوی ۔۔۔ ۶۶
۱۱ محبت بھری باتیں ۔۔۔ ۷۲
۱۲ سوت ۔۔۔ ۷۹

۱۳ جوار بھاٹا ۔۔۔ ۸۹
۱۴ نووارد ۔۔۔ ۹۹
۱۵ لگاوٹ ۔۔۔ ۱۰۳
۱۶ جائزہ ۔۔۔ ۱۱۱
۱۷ نوک جھونک ۔۔۔ ۱۱۷
۱۸ اقرارِ محبت ۔۔۔ ۱۲۳
۱۹ رفتہ رفتہ ۔۔۔ ۱۳۱
۲۰ نیا باب ۔۔۔ ۱۴۰
۲۱ شفقتِ پدری ۔۔۔ ۱۵۰
۲۲ تربیت گاہ ۔۔۔ ۱۵۷
۲۳ ڈاکو ۔۔۔ ۱۶۸
۲۴ ماہرو کی سرگزشت ۔۔۔ ۱۷۶
۲۵ پردیں ۔۔۔ ۱۸۹
۲۶ آپس کی باتیں ۔۔۔ ۲۰۱
۲۷ زوردار مقابلہ ۔۔۔ ۲۰۷
۲۸ بھوکا شیر ۔۔۔ ۲۱۴
۲۹ حیرت انگیز ۔۔۔ ۲۳۲
۳۰ کشمکش ۔۔۔ ۲۴۴
۳۱ صاف صاف باتیں ۔۔۔ ۲۵۶

۳۲ فیروزہ کی آمد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۶۵
۳۳ حادثہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۷۶
۳۴ اعتراف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۸۵
۳۵ فیصلہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۹۹
۳۶ انجام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۰۷

طوفان

طوفان! صرف دریاؤں اور سمندروں ہی میں نہیں آتے، زندگی میں بھی آتے ہیں، زندگی بجائے خود ایک اتھاہ سمندر ہے، اور اس سمندر میں جو طوفان آتے ہیں وہ قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

ایسا ہی ایک طوفان اس ناول کا موضوع ہے، میں اگر یہ کہوں کہ یہ طوفان وہ طوفان ہے، جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے۔

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا، یہ طوفان جیسا ہولناک ہے، اس کے مصور نے، تصویر کھینچنے میں اور نقش و نگار کی رنگ آمیزی میں بھی ویسا ہی لرزہ خیز کمال دکھایا ہے۔

اردو ادب میں اپنی نوعیت کا یہ بالکل پہلا ناول ہے۔

محمد اقبال سلیم گاہندری

یہ ناول

میں اس ناول کے بارے میں زیادہ شرح وتفصیل سے کام لینا نہیں چاہتا، صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو ادب میں یہ ناول ایک اضافہ ہے!

ہماری سماج کی بہت سی دُکھتی ہوئی رگیں ہیں، انہی میں سے ایک یہ رگ ہے، جس پر نشتر لگایا گیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ زندگی اپنی پہنائیوں میں عجیب عجیب چیزیں پوشیدہ رکھتی ہے، انھیں کبھی اُجاگر کیا جاتا ہے، تو لوگ حیرت کرتے ہیں، حیرت کرنے سے پہلے اگر وہ دماغ سے کام لیں، تو اعتراف حقیقت ان کے لئے ناگزیر ہوگا!

رئیس احمد جعفری
۸ رمئی ۱۹۴۸ء

باب ۱

عجیب میزبان

مجھے تسنیم سے محبت تھی بے پناہ محبت، وہ مجھے چاہتی تھی، میں اس پر فریفتہ تھا، اب تک ہم دونوں کی شادی نہ ہوسکی تھی۔ کبھی کبھی تو یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ شادی ہو بھی سکے گی یا نہیں؟ کچھ ایسے ہی خلاف توقع مواقع پیدا ہوجایا کرتے تھے!

وہ لکھنؤ میں تھی، میں ایک دور اُفتادہ شہر کلیانی کے بینک کا منیجر تھا، ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے، لیکن ہمارے دل اتنے ہی قریب تھے، میں اسے درد بھرے خط لکھا کرتا تھا، وہ اپنے خطوں میں اپنا دل کھول کر رکھ دیتی تھی۔

ایک روز میری طبیعت گھبرائی، تسنیم کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی، میرا جی چاہ رہا تھا، پر پرواز لگ جائیں اور میں اُڑ کر لکھنؤ پہنچ جاؤں، وہی لکھنؤ جہاں میری آرزوؤں کا نشیمن ہے، بلا ارادہ میں نے اچکن پہنی، اور چل کھڑا ہوا، شاید سیر سپاٹے سے طبیعت بہل جائے۔

چلتے چلتے میں ایک پارک کی طرف پہنچا، شام کا وقت تھا، میں ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا، کچھ دیر بعد ایک بوڑھا آدمی آیا، میرے برابر بیٹھ کر اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی ایک سگریٹ خود لیا دوسرا میری طرف بڑھا دیا، میں نے شکریہ کے ساتھ سگریٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس نے کہا،

"آپ اس شہر میں شاید نئے نئے آئے ہیں؟"

اس کی یہ بے تکلفی مجھے بُری معلوم ہوئی، لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا "جی ہاں" کہہ کر خاموش ہو گیا؛

اس نے کہا "آپ نے یہاں کی تمام قابل دید چیزیں دیکھ لیں؟"

"جی نہیں"!

وہ خاموش ہو گیا، لیکن میرے دل میں اشتیاق پیدا ہوا، میں کلیانی کو ایک بڑا تجارتی شہر تو ضرور سمجھتا تھا، لیکن وہاں کچھ قابل دید چیزیں بھی ہیں یہ کسی نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"کون کون سی قابل دید چیزیں ہیں؟"

"یوں تو بہت ہیں، لیکن میں آپ کو صرف ایک چیز دکھا سکتا ہوں"

"لیکن اب تو شام ہو چکی ہے، اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے"

"جی وہ چیز رات ہی کو دیکھی جاتی ہے، جتنے اندھیرے میں اسے دیکھئے گا، اتنی ہی وہ چاند کی طرح چمکے گی"

میں سمجھ گیا، یہ دلال ہے، شکار پھانسنے نکلا ہے، میں نے کہا،

"آپ مجھے غلط سمجھے، میں رنڈیوں کے ہاں نہیں جاتا"!

"حضور ماف (معاف) کیجئے گا، آپ بھی مجھے غلط سمجھے، نہ میں بھڑوا ہوں، نہ کسی رنڈی کا دَلّال، بوڑھا آدمی ہوں لیکن دل جوان ہے، گانا سُن لیتا ہوں، میں شہر شہر گھوما ہوں، بڑی بڑی گانے والیوں کا گانا سُنا ہے، لیکن سچ کہتا ہوں، عشرت کی سی گانے والی میں نے آج تک دیکھی نہیں بڑھیا ہے کمبخت، شاید دو چار برس مجھ سے چھوٹی ہو لیکن کیا گلا پایا ہے ظالم نے، جتنی بوڑھی ہوتی جاتی ہے، اس کا فن جوان ہوتا جاتا ہے، اب تو خیر وہ بڑھیا ہے، لیکن جب وہ جوان تھی، تب بھی رنڈی نہیں تھی، اس کی تہذیب اور شائستگی دیکھو گے میاں صاحبزادے تو عش عش کرنے لگو گے، سمجھتے کیا ہو اسے؟"

یہ الفاظ کام کر گئے، میں نے کہا:

"معاف کیجئے گا، مجھے غلط فہمی ہوئی تھی، گانے کا تو میں بھی بڑا

رہا ہوں، اگر آپ چلتے ہیں تو چلئے!"

کہنے لگے:

"چلئے کیا خاک! تم نے مزہ کرکرا کر دیا یہ باتیں کسی اور نے کہی ہوتیں تو ۔ ۔ ۔ !"

میں نے کہا:

"تو آپ ان کمزور ہاتھوں سے اُسے ذبح کرتے اور اپنے پوپلے منہ سے کچا چبا جاتے کیوں؟"

یہ کہہ کر میں زور سے ہنسا، وہ بھی مسکرائے، کہنے لگے:

"چلو دیر ہوگئی تو وہاں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔"

باب ۲
بُت کدہ

ہم لوگ کچھ دُور تک تو پیدل چلے، پھر بڑے میاں نے ایک ٹیکسی کرلی ڈرائیور سے کہا: "قلعہ کی طرف چلو"

کار پوری رفتار کے ساتھ اُڑی چلی جارہی تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ میرا دل اُڑا چلا جارہا تھا! طرح طرح کے وہم آرہے تھے، قتل و خون کی اخباری خبریں رہ رہ کر مجھے یاد آنے لگیں، تکلف برطرف میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو خطرات کے موقع پر چڑی ثابت ہوتے ہیں، میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے، اور دل میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی؛

دِل ہی دل میں بار بار میں اپنے اوپر نفریں کر رہا تھا، کہ ایک ناواقف آدمی کے چنگل میں کیوں پھنس گیا، لیکن اب تو نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا، کبھی جی چاہتا کہ کود پڑوں ٹیکسی پر سے

زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے ــــ جان تو بچ جائے گی، لیکن بدقسمتی سے چلتی ہوئی ٹیکسی پر سے پھاندنا بھی جرات طلب تھا، اور یہاں اسی جنس بے بہا کا کال تھا،

ٹیکسی رواں دواں تھی، بوڑھا بھی خاموش تھا، میں بھی اور ڈرائیور بھی، لیکن ٹیکسی کا انجن چل رہا تھا، اور بڑی تیزی سے چل رہا تھا، یہ فیصلہ مشکل ہے کہ وہ زیادہ تیز چل رہا تھا، یا میرا دل؟ یا میرا دماغ؟ یا میرا خیال؟

قلعہ کے قریب پہنچکر بوڑھے نے ڈرائیور سے کہا، "روک لو"

ٹیکسی کا بل آج کے نئے اور عجیب میزبان نے ادا کیا، اب ہم لوگ پھر پیدل چلنے لگے، راہبر کی چال سے اطمینان ٹپکتا تھا، اور رہرو گھبرایا ہوا تھا، وہ راہبر کو کبھی خضر سمجھنے لگتا، کبھی رہزن، جیسے اندھیری رات ہو اور ایک چھوٹی سی کشتی ساحل سے دور طوفان کی گود میں اور پُرشور موجوں کے دامن میں ہچکولے کھاتی چلی جارہی ہو، میری کیفیت اس وقت یہی تھی، رات اندھیری تھی ــــ بلیک آؤٹ کی وجہ سے اور زیادہ اندھیری ہوگئی تھی، راستہ سنسان تھا، ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے، بادل چھایا ہوا تھا، اور بارش اب ہوا ہی چاہتی تھی؛

میں نے پوچھا:

"اِتنی دیر ہوگئی چلتے چلتے ابھی اور کتنی دُور جانا ہے؟"

جواب ملا:

"بس اب پہنچ گئے، یہ رہی منزلِ مقصود!"

یہ کہکر وہ ایک عالی شان مکان کے احاطہ میں داخل ہوا۔ اب میرا دل ٹھہرا، اور میں اطمینان سے اس کے پیچھے ہولیا، لیکن بہت جلد میرا اطمینان کافور ہوگیا، میں نے غور جو کیا تو معلوم ہوا یہ مکان تو راستہ سے بھی زیادہ سنسان ہے،

صدر دروازہ چھوڑکر وہ مکان کے پیچھے گیا، یہاں ایک آہنی زینہ لگا ہوا تھا، شاید گھر کے ملازمین کے لئے ہوگا، بوڑھا بے تکلف چڑھنے لگا، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا،

دروازہ پر پہنچ کر ایک خاص انداز کے ساتھ جس میں یقیناً کوئی اشارہ پنہاں تھا، اس نے تین بار دستک دی، ایک سن رسیدہ عورت باہر نکلی اور پیچھے اُتر گئی، ہم لوگ اندر داخل ہوئے؛ اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا، ہم ایک غلام گردش سے ہوتے ہوئے ایک وسیع اور شاندار ہال میں داخل ہوئے، یہاں پہنچ کر تو میری آنکھیں کھل گئیں، یہ ہال تھا یا ایوانِ زرنگار؟

اعلیٰ درجہ کے ریشمی پردے دروازوں پر لٹک رہے تھے، نہایت قیمتی ایرانی قالین فرش پر بچھے ہوئے تھے، بالکل نئے ڈیزائن کے صوفے رکھے ہوئے تھے، دیواروں پر روغنی تصویریں

آگے کئے ہوئے وہ اس طرح کھڑی تھی گویا ریشمی پردہ کے وہ دونوں پلّو پر تھے، اور اب پرستان کی یہ پری اُڑنے کے لئے پر تول رہی ہے،

میں نے اس طرف دیکھا، اور آنکھیں نیچی کرلیں، چمکتے ہوئے سورج سے کون آنکھیں لڑا سکتا ہے؟

آویزاں تھیں، جو اپنی آب و تاب اور رنگینی و رعنائی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھیں، علاوہ ازیں دیواروں پر مختلف تاریخی مناظر کی نقاشی اس خوبی سے کی گئی تھی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی قالینوں کا یہ حال تھا کہ ٹخنوں تک پاؤں اِن میں دھنس جاتے تھے، ایک کونے پر ریڈیو رکھا ہوا تھا، بوڑھے نے مجھ سے کہا،

"بیٹھئے میں ابھی آیا!"

یہ کہکر وہ بازو کے کمرہ میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد، اس کمرہ کا ریشمی پردہ کسی نے اُٹھایا مجھے یہ معلوم ہوا کہ اندھیری رات میں چودھویں کا چاند طلوع ہو رہا ہے، ایک حسین و جمیل مجسمہ، رعنائی و زیبائی کا پیکر سحر طراز آنکھیں، چہرہ پر ملاحت و صباحت کا غازہ، _____ سامنے کھڑا ہوا ہے، اس کی آنکھیں میری طرف ہیں اور دل میں پیوست ہوتی جارہی ہیں، یہ کمرہ مجھے اس وقت ایک بُت کدہ معلوم ہو رہا تھا جس میں حسن و جمال کا صنم دلربا پوری شان و تمکنت کے ساتھ برانگیختہ نقاب کھڑا تھا،

میں سمجھا میں خواب دیکھ رہا ہوں، اس نے پردے کے دونوں پلّو اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے اور بیچ میں وہ خود کھڑی ہوئی تھی، سر کے بال کھلے ہوئے، باہیں نیم عریاں، صراحی دار گردن، اوپر کو اُٹھی ہوئی، آئینہ کی طرح صاف و شفاف سینہ کو

باب ۳

جلوۂ بے محابا

وہ مسکراتی ہوئی ایک شانِ دلربائی کے ساتھ میری طرف بڑھی، قریب آکر ٹھٹکی، اس نے مجھے اور میں نے اسے دیکھا، پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوئی،

"ہے اجازت بیٹھ جاؤں؟"

یہ کہکر وہ مسکرانے لگی، میں بے خودی سے چونکا، میں نے جواب دیا،

"آیئے تشریف رکھیے۔"

وہ میرے پاس پہلو سے پہلو ملاکر بیٹھ گئی۔

میری رگوں میں اس وقت اس تیزی سے خون گردش

کر رہا تھا، کہ اندیشہ ہوتا تھا کہیں رگیں نہ پھٹ جائیں۔

اس اتصال نے میرے اندر بجلی کی سی ایک لہر پیدا کر دی ایک رو تھی جو سارے بدن میں دوڑی جا رہی تھی؛

اور کچھ ایسی ہی کیفیت اس کی بھی تھی، اس کی سانس میں اس وقت اتنی شدت پیدا ہوگئی تھی کہ نفس کی آمد و شد کے ساتھ سینہ کا نشیب و فراز صاف محسوس ہوتا تھا؛

اس کے موتی کے سے آبدار دانت اس کی ہرنی کی سرگیں آنکھیں اس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے بازو، ان سب کا مجموعہ اتنا ہولناک تھا، کہ دل کے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے، میں بولنا چاہتا تھا لیکن تاب تکلم مفقود تھی، اس نے کہا،

"معاف کیجئے گا، میں آپ کے سکون میں مخل ہوئی!"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ بات تو نہیں ہے!"

"پھر کیا بات ہے؟ آپ اتنے شرمیلے کیوں ہیں عورت سے بھی زیادہ؟"

"جی یہ بات بھی نہیں ہے۔"

"نہیں صاحب، کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، آخر آپ چپ چپ کیوں ہیں؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، یہ ایک رنگین خواب ہے، یا میرے وہم و تصور کی گلکاری؟"

"یہ کیوں؟ یہ کیوں سوچا آپ نے؟"

"میں یہاں کس طرح آگیا؟"

"پہنچ گئے آپ ہماری بارگاہ میں اب فخر کیجئے اپنی خوش قسمتی پر!"

یہ کہہ کر وہ ہنسی!

میرا جی چاہ رہا تھا، میں اسے اپنی آنکھوں میں بٹھاؤں، اپنے دل میں رکھ لوں، اپنے سینہ میں بند کرلوں، اسے دیکھ دیکھ کر میرے جذبات انگڑائیاں لے رہے تھے، میں از خود رفتہ ہوا جارہا تھا، کسی بھوکے کے سامنے اگر خوانِ نعمت رکھ دیا جائے تو پہلے وہ شکم سیر ہوکر کھائے گا، پھر سوچے گا، یہ مال کس کا تھا؟

یہی کیفیت میری تھی، میرے سامنے خوان نعمت رکھا ہوا تھا۔ میں بھوکا بھی تھا۔ میں جلد از جلد اُسے کھالینا چاہتا تھا!

میری آنکھیں اوپر اُٹھیں، پپوٹے اتنے بھاری ہورہے تھے کہ آنکھوں کا اُٹھنا مشکل ہورہا تھا، میں نے اس کے چہرے پر نظر جما دی، جیسے تیر ترکش سے نکل کر اپنے ہدف کو چھید لے، اور وہیں جم جائے، اس کی آنکھیں پلکوں کا گھونگھٹ اُٹھا کر مجھ سے ملیں، اور مجھے غالب کا یہ شعر بے ساختہ یاد آگیا ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو ایک نظر میں رضامند کر گئی

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، وہ پھول سے زیادہ نازک، روئی سے زیادہ نرم، لیکن میرے سے زیادہ سخت تھا، اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں کیا آیا یہ معلوم ہوا، پاور ہاؤس، میری مٹھی میں ہے، اور مٹھی سے وہ دل میں، جگر میں، رگوں میں، روح میں سرایت کئے جارہا ہے۔

وہ خود بھی اس وقت جذبات کے پُرشور سمندر میں تنکے کی طرح بہتی ہوئی معلوم ہورہی تھی، اس کی آنکھوں میں لال ڈورے اس طرح اُبھرے ہوئے تھے، جیسے قسمت کی لکیریں، اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا، اپنا ہاتھ چھڑائے بغیر وہ کھڑی ہوئی، اس نے کہا:

"یہاں نہیں چلئے اُس کمرے میں چلیں"

جس کمرہ سے وہ چودھویں کا چاند بن کر باہزاراں شان یکتائی طلوع ہوئی تھی، اسی کمرہ میں وہ مجھے لے کر پہنچ گئی۔

وہ ہال اگر بت کدہ تھا، تو یہ کمرہ نگارخانہ تھا، وہاں تصویریں تھیں خواب و خیال کی، وہم و فکر کی، ذہانت اور آرٹ کی، یہاں صرف ایک نگارِ خوب رو تھا، اور وہ ان سب پر بھاری تھا، وہ تصویریں خاموش تھیں، انسان کی بنائی ہوئی تھیں، اس لئے آب و رنگ رکھنے کے باوجود نقلی تھیں، اور یہ نگار گلعذار جیتا جاگتا مرقع تھا حُسن کا رعنائی کا، شباب کا، اس میں زندگی تھی، تڑپ تھی، اور آب و رنگ بھی، یہ قدرت کا بنایا ہوا تھا، اس لئے یہی اصل تھا۔

میں نے بڑے بڑے صناعوں اور فن کاروں کے سنگی اور مرمریں مجسمے دیکھے ہیں، میری نظر سے بڑے بڑے مصوروں اور نقاشوں کی تصویریں اور نقوش گزرے ہیں، جن میں شباب کو سمویا گیا تھا، حسن کو جذب کیا گیا تھا، رعنائی، اور دل کشی کو اُجاگر کیا گیا تھا لیکن اس مجسمہ کو جو اس وقت میرے پہلو میں تھا، اگر عہدِ قدیم یا جدید کا کوئی صناع دیکھ لیتا، تو اُس کو بنیاد قرار دے کر اپنے ہنر کی داد حاصل کرتا، شباب کی ایسی جیتی جاگتی تصویر، حسن کا ایسا چلتا پھرتا مجسمہ ـــــ صناع، مصوّر اور نقاش کا کیا ذکر، چشمِ فلک نے کم دیکھا ہوگا!

یہ اوسط درجہ کا کمرہ تھا، لیکن بیش قیمت سامان سے آراستہ یہاں لکڑی کی جو چیزیں تھیں، وہ یا صندل کی تھیں، یا آبنوس کی، کپڑا اگر تھا تو صرف ریشم، دروازہ کے پَردہ سے لے کر مسہری کی چادر تک حریر و پرنیاں کے سوا کچھ نہ تھا!

ہم دونوں اس کمرہ میں داخل ہوئے، میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے دروازہ اندر سے بند کیا، اور نسیم بہار کی طرح اٹھکیلیاں کرتی موجِ بہار کی طرح بل کھاتی، نسرین و نسترن، اور گلاب و یاسمین سے زیادہ مجسم خوشبو بنی ہوئی، آنکھوں سے تیر چلاتی، اور چہرہ پر معصومیت کی ڈھال رکھے میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی، وہ کھڑی تھی، میں بیٹھا تھا، اس نے دونوں ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھے، اور جھک کے مجھے

دیکھنے لگی،

جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو!

اب مجھ میں تاب ضبط نہیں تھی، میں نے اس کی نازک کمر کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا، وہ میرے جھونک کی تاب نہ لا سکی، میں نے اپنے بازو اس کی کمر میں حمائل کیے اور اسے اس طرح رکھ لیا، جیسے نرم، نازک اور لطیف پھولوں کا گلدستہ ـــــــــــ

وہ اب میرے پہلو میں تھی اور کم از کم اس وقت صرف میری تھی!

باب ۴

وہ رات

اس کی آنکھوں کی شراب اس کے ہونٹوں میں اُتر آئی تھی، اور میں اسے ایک رند بلانوش کی طرح پی رہا تھا، اس کا حسن سمٹ کر اس کے پھول سے گالوں میں آگیا تھا، اور میں بھونرے کی طرح ان پھولوں کا رس لے رہا تھا، اس کی جوانی کا طوفان پکے ہوئے پھل کی طرح اُسے چمنستان بنائے ہوئے تھا، اور میں فکرِ مآل سے بے خبر دونوں ہاتھوں سے یہ فصلِ بہار لوٹ رہا تھا۔

وہ مجھ سے زیادہ بیتاب تھی، اور میں اس سے زیادہ مدہوش تھا، جوانی کا طوفان سب سے پہلے دل کے سفینہ پر حملہ کرکے ہوش کے بادبان اور عقل کے چپو کو بیکار کر دیتا ہے، یہی حالت اس وقت ہم دونو کے سفینۂ دل کی تھی، بادبان ہوش ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا، اور عقل کا چپو شہیوں کی گرفت سے آزاد تھا، طوفان تھا بلا خیز، طوفان اندھیرا تھا۔ ہولناک اندھیرا، موجیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، لہریں اس زور سے

اٹھتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا، سمندر کی تہہ کو بھی اپنے ساتھ سطح پر لے آئیں گی، ——— اور ہمارے دل کا سفینہ تہہ و بالا ہوتا، اُبھرتا اور ڈوبتا، بڑھتا، اور پیچھے ہٹتا، اُٹھتا، اور گرتا چلا جا رہا تھا، نہ جانے کس طرف، نہ منزلِ متعین تھی، نہ ساحل کا کوئی نشان تھا، نہ کوئی مینارۂ نور تھا، جس کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتی ہے،

حُسن ——— عشق کی پذیرائی کے لئے ہمہ تن سپردگی، ہمہ اخلاق و نیاز بنا ہوا تھا، عشق ——— حُسن کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا تھا، حل کر لینا چاہتا تھا۔

اس وقت زبان گویا خاموش تھی، دل کی دل سے آنکھ کی آنکھ سے نفس گرم کی، گرم سانسوں سے، لب کی لب سے باتیں ہو رہی تھیں، یہ باتیں اتنی دلچسپ اور اتنی دلآویز تھیں کہ زبانِ گویا کو جنبش کرنے کی فرصت ہی نہ تھی،

بے خودی کا دَور ختم ہوا، ہم دونوں پھر ہوش و حواس کی دُنیا میں پہنچ چکے تھے۔

وہ اپنے اُلجھے ہوئے بال، اور اپنے مجروح و خستہ چہرہ کو درست کر رہی تھی، اور میں ایک فاتح کی شان سے اس کی مسہری پر لیٹا ہوا سگرٹ پی رہا تھا،

وہ آئینہ کے سامنے گئی، اس نے اپنا جائزہ لیا ———

اس وقت اس کا حُسن کچھ اور نکھر آیا تھا، آئینہ میں اس نے اپنی

آنکھوں سے آنکھیں ملائیں لب نازک پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور آکر
میرے پاس بیٹھ گئی۔

میں اسے مبہوت بنا دیکھ رہا تھا، میں غور کر رہا تھا، یہ بیتاب
روح اور یہ حسین مجسم ـــ یہ حسین جسم اور یہ بیتاب روح اُس
کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا، اس کی آنکھوں سے شراب کی
بارش ہو رہی تھی، وہ میرے لئے مجسم مقناطیس تھی، اور میں اس کے
لئے سراپا کہربا!

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پلک کے غلاف سے باہر نکالیں
جیسے نیام سے کسی بانکے سپاہی نے تلوار نکال لی ہو ـــــــــ
اور مجھے تکنے لگی، میرا خون منجمد ہونے لگا، میں نے کہا،

"اِس طرح مت دیکھو تم مجھے!"

"کیوں نہ دیکھوں؟ پھر کس طرح دیکھوں؟"

"میں تمھاری شمشیر صفت آنکھوں کی تاب نہیں لا سکتا۔"

"کیا بات ہے میری آنکھوں میں کچھ بتائیے تو؟"

"تمھاری آنکھوں سے تیر نہیں تلواریں برس رہی ہیں، میرا دل
چھلنی ہو چکا ہے اب بس کرو!"

"باتیں بنانا خوب آتی ہیں آپ کو!"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا، وہ اور میرے قریب آگئی،
جیسے وہ اس کی منتظر تھی کہ میں اُسے کھینچوں اور وہ مجھ سے اور زیادہ

قریب آجائے،

میں نے کہا:

"میرے دل پر ہاتھ رکھو۔"

اس نے مسکرا کر جواب دیا:

"ڈر لگتا ہے!"

میں نے پوچھا:

"کیوں؟"

"کہیں وہ کاٹ نہ کھائے!"

یہ کہتے کہتے اسے خود ہنسی آگئی، اتنی ہی دیر میں وہ بڑی
بے تکلف ہو گئی تھی، قہقہہ مار کر ہنسنے لگی، میں نے بھی زور سے
ایک قہقہہ لگایا اور کہا:-

"یہ میرا دل ہے بھیڑیا نہیں ہے!"

"ہم کیا جانیں۔"

"پھر تم اس پر ہاتھ رکھتے ڈرتی کیوں ہو؟"

"سُنا ہے کہ بڑی ڈراؤنی چیز ہوتی ہے یہ!"

"کس سے سُنا؟"

"کیوں بتائیں یہ راز کی بات ـــــــــ اچھا اچھا
بگڑیئے نہیں کتابوں میں پڑھا ہے!"

میں نے کہا:-

"لیکن میں تو نہیں ڈرتا تمہارے دِل سے، لاؤ ہاتھ رکھ کر بتا دوں؟"

یہ کہہ کر میں بڑھا، اور وہ برق جہندہ کی طرح ایک جھپکا مار کر مسہری سے اُٹھی، اور سامنے جو کرسی پڑی تھی، اس پر جا کر بیٹھ گئی، کہنے لگی،

"ابھی جی نہیں بھرا؟ پھر وہی چھیڑ چھاڑ؟"

"جی تو زندگی بھر نہیں بھر سکتا میرا"

"توبہ بھئی، اتنا بھی کوئی ندیدہ نہ ہو"

"تم چیز ہی ایسی ہو کہ تمہیں دیکھ کر، تمہیں پا کر،

"نہ خدائی کی ہو پرواہ نہ خدا یاد رہے"

"کون سے ہیرے جواہر جڑے ہیں مجھ میں؟"

"آئینہ سامنے ہے اُٹھو جا کر دیکھ لو"

"میں تو روز دیکھتی ہوں آئینہ مجھے تو کچھ نہیں دکھائی دیتا"

"تم نے میری آنکھوں سے نہیں دیکھا اپنے تئیں ورنہ یہ کہتیں"

"کیوں ذرا بتائیے تو؟"

"لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید"

"اوہو اتنی جلدی آپ مجنوں بھی بن گئے؟ ہمیں تو ڈر لگنے لگا آپ سے سچ!"

میں نے پوچھا "آخر کیوں؟"

کہنے لگی:-

"خاک نہ اُڑانے لگئے گا کہیں"

ملتی رہو گی تو خسرو پرویز کی طرح زندگی کا عیش میرا حصہ ہو گا، غافل کرو گی تو کوہکنی کرتے پاؤ گی مجھے"

"اے واہ! ابھی آپ مجنوں تھے ابھی فرہاد بن گئے، گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ (مسکرا کر) واقعی مرد کی ذات بھی عجیب ہوتی ہے!"

"یہی مرد عورتوں کے متعلق فرماتے ہیں"

"کہا کریں، گز بھر کی زبان ہوتی ہے مردوں کی، ان کی زبان کو کون پکڑ سکتا ہے بھلا؟"

"گز بھر کی زبان بھی نہیں پکڑی جا سکتی تو پھر کیا تم عورتوں کے لئے دس گز کی زبان چاہیئے؟ جھولا جھولو گی اسے پکڑ کر؟"

وہ مسکرا دی!

اتنے میں گھڑی نے ۴ بجائے، کسی نے دروازہ تھپتھپایا، وہ بے پروائی کے انداز سے اُٹھی، دروازہ کھول دیا اس نے۔

"بڑے میاں اندر آئے، کہنے لگے چلئے، میں نے کہا چلئے،

چلتے وقت اس نے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا، میں نے کہا:

"یہ کیا ہے؟"

"معہ"

"کیسا معہ"؟

"میں السٹریٹڈ ویکلی کے معمے حل کیا کرتی ہوں، مجھے بڑا شوق ہے ان کا یہ میرا حل ہے، ذرا ایک نظر آپ بھی ڈال لیجئے گا۔"

"لیکن معموں سے مجھے ذرا دلچسپی نہیں ہے، میں کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں، آپ مدد نہیں کر سکیں گے، داد تو دے سکیں گے دیکھئے گا کتنی ذہانت صرف کی ہے میں نے اس پر، رات کو لیتے آئیے گا اسے اپنے ساتھ!"

میں نے وہ لفافہ جیب میں رکھ لیا،

دروازہ تک وہ میرے ساتھ آئی، میں نے اس پر نگاہ ڈالی تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، منہ زور گھوڑے کی لگام پوری قوت سے کھینچ کر اسے قابو میں رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے، آنسو نکلنے کے لئے بے چین تھے، لیکن وہ ان آبدار موتیوں کو صدف چشم سے نکال کر خاک کا زیور نہیں بنانا چاہتی،

وہ واپس چلی گئی، اور میں اس بوڑھے کے ساتھ پھر اسی ویران سنسان اور تاریک دنیا میں پہنچ گیا، جہاں سے ہو کر ابھی اس روشن اور تابناک دنیا میں پہنچا تھا،

اب پھر میرے دماغ کو سوچنے کی طاقت مل گئی تھی، اور وہ سوچ رہا تھا یہ بوڑھا رہبر ہے یا رہزن ہے؟

میں نے بڑی سڑک پر پہنچنے کے بعد بوڑھے سے کہا:

"اب آپ تکلیف نہ کیجئے، مجھے راستہ معلوم ہے میں چلا جاؤں گا۔"

وہ واپس چلا گیا، جاتے جاتے اس نے کہا:

"آج رات کو ۹ بجے!"

میں نے کہا: "ضرور" اور میں واکنگ کو نکل گیا، میری عادت ہے۔ میں علی الصباح چہل قدمی کیا کرتا ہوں!

باب ۵
عالمِ خیال

چہل قدمی سے فارغ ہوکر میں اپنی قیامگاہ پر پہنچا، ملازم نے جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا، ناشتہ سے فارغ ہوکر میں اس ارادہ سے چارپائی پر لیٹا کہ رات بھر کا جاگا ہوں اب سو رہوں،

لیکن نیند غائب تھی، میں سوچ رہا تھا، کون ہوسکتی ہے یہ عورت؟ کس خاندان کی چشم و چراغ ہے یہ؟

حیرت کے ساتھ میں سوچ رہا تھا کہ یہ تجربہ کار بھی ہے اور سادہ لوح بھی ہے، اور چالاک بھی۔ اس کی اداؤں میں معصومیت بھی ہے۔ اور صیادی بھی، اس کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آبرو باختہ عورتوں کی طرح یہ فنونِ آوارگی کی ماہر ہے، لذت شناس بھی ہے، لذت آفریں بھی، اور بجائے خود ایک لذت، ایک کیف، ایک سرمستی بھی، اور غور سے دیکھئے تو ان خصائص کے باوجود عملاً انجان بھی، اچھوت بھی، میں خود اس کا گواہ ہوں، کہ آج رات سے پہلے وہ ہوسِ مردانہ کے دستِ گلچین سے محفوظ تھی، اس کا شباب ایک سربلند

جامِ شراب تھا، جسے کسی نے ابھی تک نہیں چھوا تھا،

اور ہاں یہ چلتے وقت میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں دیکھے تھے؟ رات بھر ہنس ہنس کے داد عیش و طرب دیتی رہی، رات بھر سرمستی کی دنیا میں خود کھوئی رہی اور مجھے گم رکھا، لیکن چلتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی کیوں جھلکنے لگے؟

کیا وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے ——— ایک انجان آدمی سے؟ جسے نہ وہ جانتی ہے، نہ پہچانتی ہے، کیا محبت اس قدر جلد ہوسکتی ہے؟ اور اگر ممکن ہے، تو ایسی انجان محبت کوئی تماشین عورت نہیں کرسکتی، لیکن اس عورت کے تماشین ہونے میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے جو رات کی تاریکی میں اپنے دلال چھوڑ دیتی ہو، اور وہ نوجوانوں کو بہلا پھسلا کر اس کے پاس لاتے ہوں، کہ وہ اس کی ہوس کے چمن کو خوب سیراب کریں؟

مانا کہ اس کا دلال پہلے پہل جس نوجوان کو پھانس کر لایا وہ میں تھا لیکن میرے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے، اور یقیناً جاری رہیگا یہ عورت پاک دامن نہیں ہوسکتی، لہٰذا محبت جیسی مقدس امانت کی حامل بھی نہیں ہوسکتی۔

انجان محبت صرف بیوی کرتی ہے، وہی کرسکتی ہے، وہ اپنے شوہر کو خداوند مجازی سمجھنے لگتی ہے،

بیوی کے تخیل کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے تسنیم کی صورت

پھرنے لگی، وہ اس کا حسن معصوم، وہ اس کی دل داری اور دل دہی، وہ اس کی وفا آبی، اور وضعداری، وہ اس کا خلوص اور بے لوث ربط،

دل نے کہا یوں ایسی ہوتی ہے، ایسی ہی ہونی چاہیئے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے باطل ہے، اب مجھے اس عورت سے نفرت سی ہونے لگی تھی وہ اور تسنیم تصور کے چوکھٹے میں برابر کھڑی تھیں، ایک کے چہرہ پر قدوسیت عفت اور پاک دامنی کا نور برس رہا تھا، دوسری کی صورت پر ہوس، آوارگی اور بدچلنی کی آگ دہک رہی تھی، یہ وہ عورت تھی جس کے پاس میں ابھی رات گزار کر آیا تھا۔

اب نیند آ رہی تھی، عالم خواب اور عالم بیداری کا فاصلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا، کہ میری آنکھوں میں اس عورت کے وہ آنسو کنکر بن کر چبھنے لگے تھے، ——— پھر یہی کنکر ———

پتھر بن کر نیند کے سر پر برسنے لگے اور وہ بیچاری منہ ڈھانپ کر بھاگ گئی اتنی تیز بھاگی کہ کوسوں دُور نکل گئی، اب پھر میں بستر پر کروٹ بدل رہا تھا بے کلی اور بے چینی کے ساتھ!

پھر ایک ایک کر کے مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگیں، اس کا جوش سپردگی بھی، اس کا جذبۂ نیائش بھی، اس کا احساسِ حیا بھی اور اس کا اندازِ بے تکلفی بھی، اور ——— پھر وہی آنسو۔

میں سوچ رہا تھا یہ عورت ہے یا معمّہ؟ اتنی دیر ہو گئی اسے حل کرتے ہوئے لیکن جتنا اسے سلجھاتا ہوں، اتنا ہی یہ اور اُلجھ جاتا ہے،

معمّہ کے تصور کے ساتھ ہی مجھے اس کا دیا ہوا لفافہ یاد آ گیا، جس میں اس کا حل کیا ہوا معمّہ رکھا تھا!

میں نے سوچا نیند تو آ نہیں رہی ہے لاؤ اس کا حل کیا ہوا معمہ ہی دیکھ ڈالیں، شاید توجہ بٹے اور نیند کی روٹھی رانی پھر من جائے۔

میں نے اچکن کی جیب سے وہ لفافہ نکالا، کھولا، تو اس کے اندر سے ایک اور لاینحل معمّہ برآمد ہوا، اس کا حل کرنا پہلے معمہ سے بھی زیادہ دشوار اور پیچیدہ تھا، لفافہ میں سو سو روپیہ کے دس نوٹ رکھے ہوئے تھے، ان کے ساتھ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا، جس پر لکھا ہوا تھا: (قبول فرمایئے۔)

اب تو میں خود بھی نیند سے بیزار تھا، یہ روپیہ کس لئے؟ لفافہ میرے ایک ہاتھ میں تھا، نوٹ دوسرے ہاتھ میں، اور میں دونوں کو اس طرح اپنے ہاتھ میں دبوچے ہوئے تھا، جیسے کوئی بیمار کبوتر باز بستر علالت پر لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں میں اپنے پٹھوں کو جکڑ لیتا ہے اور ان کے چشم و ابرو کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

باب ۶
شکوہ و شکایت

میں چاہتا تھا جلد دن ختم ہو اور رات آئے، کچھ اشتیاق ملاقات اور کچھ ذوقِ تجسس اور کچھ وہی نوٹوں والا معاملہ۔

لیکن یہ دن شبِ فراق سے بھی بڑھ گیا تھا، ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے دن کا سورج ڈوبا اور میری اُمیدوں کا سورج طلوع ہونے لگا، جوں جوں رات قریب آتی جاتی تھی، میرے دل کی دھڑکن بڑھتی تھی، رات آئی، اور میں منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا، وہ بوڑھا پارک میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھا، اور میرے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

کل کی طرح آج وہ مشت نہ تھی، کل پاؤں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے کا بہانہ ڈھونڈھ رہے تھے، اور آج وہ تیزی سے بڑھ رہے تھے، گویا ان میں پر لگ گئے ہیں، اور وہ اُڑے چلے جا رہے ہیں۔

بوڑھا تو کل کی طرح مجھے ہال میں پہنچا کر غائب ہو گیا، اور میں صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا، اتنے میں پردہ کو جنبش ہوئی، وہ برانگیختہ نقاب سامنے کھڑی تھی، جیسے بادل کا پردہ اٹھا کر چاند نکل آیا ہو، وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور وہیں کھڑے اس نے کہا:

"وہاں کیوں بیٹھے ہیں آجائیے یہاں۔"

میں اندر پہنچا، وہ سراپا استقبال بنی ہوئی میری پیشوائی کو کھڑی تھی، اندر جا کر میں حسب معمول بیٹھ تو گیا، لیکن چپ چپ، اس نے کہا:

"کیا بات ہے؟ یہ خاموشی کیوں؟"

"میں نے کہا:

مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی، کہ تم میری توہین کرو گی!"

(حیران ہو کر) "میں نے آپ کی توہین کی؟ یہ ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے، ہوا ہے!"

یہ کہہ کر وہ لفافہ میں نے اس کے سامنے رکھ دیا، میں نے پوچھا:

"یہ کیا ہے؟ میں اگر یہ سمجھتا کہ تم مجھے اتنا بے حیا اور ذلیل سمجھو گی تو میں قدم نہ رکھتا اس گھر میں؟"

وہ خاموش تھی، میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"یقیناً میں ایک بے مایہ انسان ہوں، تم محل میں رہتی ہو، اور مجھے جھونپڑا بھی میسر نہیں ہے، تم سونے چاندی کو کنکر، پتھر سمجھتی ہو، اور میرے پاس کنکر پتھر بھی نہیں، تم عیش اور ثروت کی زندگی بسر کرتی ہو۔

اور میں ایک بے مایہ انسان ہوں، پھر بھی میرے پہلو میں ایک خود دار اور حساس دل ہے، میں آوارہ اور لچا نہیں ہوں، پیشہ ور بدمعاش نہیں ہوں!"

میری آواز بلند ہو رہی تھی،

"جس طرح تم میرے لئے بالکل نئی تھیں، اسی طرح میں بھی تمہارے لئے بالکل نیا تھا، میں یہاں اس لئے نہیں آیا تھا، کہ کوئی کوٹھی خانہ ہے، جہاں میری جیب پر ڈاکہ پڑے گا، نہ یہ سمجھ کر آیا تھا، کہ یہ وہ بازارِ حسن ہے جہاں حسن بیچا نہیں جاتا، بلکہ خریدار بن کر گلگشت کرنا ہے، میں نہ حسن کے ہاتھ فروخت ہو سکتا ہوں، نہ اسے خریدنا چاہتا ہوں، خریدی ہوئی ہستی عارضی یا مستقل طور پر اپنی ہو جاتی ہے، لیکن اس میں جو بیزاری جو بغاوت، جو نفرت پنہاں ہوتی ہے، میں اس سے گھبراتا ہوں، اگر تم خریدار بن کر نکلی تھیں، اور متاع مقابل کا سودا کرنا چاہتی تھیں، تو تمہارے دلال نے بالکل غلط انتخاب کیا، تم اُسے بُلاؤ اس سے کہو، مجھے واپس لے جائے بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جو اپنے تئیں بیچنے پر بڑی خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، پکڑ لائے ان میں سے جتنوں کو چاہے؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، وہ ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی، لیکن میں اس وقت اتنا اونچا اُڑ رہا تھا، کہ ان سفلی باتوں پر متوجہ ہونے کی مجھے فرصت بھی نہیں تھی، میں نے پھر کہا۔

"یہ نہ سمجھنا مجھے اپنے حسن مردانہ پر ناز ہے، میں عام مردوں کی طرح

خود فریبی میں نہیں مبتلا ہوں، میں ہرگز خوبصورت نہیں ہوں، نہ اپنے تئیں خوبصورت سمجھتا ہوں، نہ میرا خیال ہے کہ عورت مجھے دیکھتے ہی پروانہ وار مجھ پر قربان ہونے لگتی ہے، لیکن میرا دل یقیناً خوبصورت ہے۔ میں اسے کائنات کی حسین ترین چیز سمجھتا ہوں، مجھے اس پر ناز ہے، میں فریب سے یہاں لایا گیا ہوں، تمہیں میں نے دیکھا، اور تمہاری آنکھوں سے دی ہوئی دعوت کو میں نے قبول کر لیا، لیکن اس سے تم نے یہ نتیجہ کیسے نکال لیا کہ میں خود فروش ہوں!"

میرا جوش خطابت ابھی آسودہ نہیں ہوا تھا، کہ وہ اُٹھی، اور میرے قدموں پر سر رکھ کر اس نے بلک بلک کے رونا شروع کر دیا،

میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، میرا وہ جوش و خروش وہ غصہ اور تیکھا پن ختم ہو گیا، پھر میرے اندر، مجنوں اور فرہاد کی روح حلول کرنے لگی،

میں نے بڑے پیار سے اس کا سر اُٹھایا، اسے اپنے زانو پر رکھ لیا، اپنے رومال سے آنسو پونچھے، میں نے کہا،

"روتی کیوں ہو؟ تم مجھے غلط سمجھیں، میں تو تمہاری نافہمی پر احتجاج کر رہا تھا!"

اس نے اپنا سر میرے زانو پر رکھے رکھے، اپنی آنکھیں میری آنکھوں سے ملائیں، اور نیم گریاں حالت میں کہا:

"آپ نے طنز کے یہ تیر چلانے کے بجائے، خنجر کی نوک اُتار دی ہوتی میرے سینے میں تو ذرا بھی شکوہ نہ کرتی میں، لیکن سوچئے تو آپ کیا کیا کہہ گئے؟"

میں کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اس نے کہا،

"آپ مجھے آبرو باختہ سمجھتے ہیں، حالانکہ آپ خود اس کے گواہ ہیں کہ میں نے اپنی آبرو اگر گنوائی تو آپ ہی کے ہاتھوں"

"ہاں ـــــ ٹھیک کہہ رہی ہو تم!"

"آپ نے مجھے طعنہ دیا، کہ میں دلال بھیج بھیج کر لوگوں کا شکار کرتی ہوں لیکن آپ نے یہ نہ دیکھا، یہ نہ پوچھا، یہ نہ سوچا، کہ آخر مجھ جیسی عورت جو تعلیم یافتہ بھی ہے، خوبصورت بھی ہے، دولت مند بھی ہے، کیوں اس راہ پر آئی؟"

"اب پوچھتا ہوں بتاؤ!"

اس نے میرے زانو پر سر رکھے رکھے، بڑے ناز سے گردن ہلائی اور کہا:

"نہیں بتاؤں گی پہلے آپ معافی مانگئے!"

"معافی مانگوں؟"

"ہاں معافی مانگئے، آپ نے میری ـــــ میری نہیں میرے دل کی توہین کی ہے!"

"توہین"؟

"ہاں ـــــ ناقابل معافی توہین، آپ کی خودداری، مردانہ وقار، دل کی سادگی، اور بھولے پن نے میرے دل میں اب سچ مچ آپ کی محبت پیدا کر دی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جس جنس بے بہا کی مجھے

تلاش تھی، وہ مجھے مل گئی، اب میں اپنے اندر آسودگی پاتی ہوں، استغنا دیکھتی ہوں، میرے جذبات سفلی کا بند ٹوٹ گیا تھا، لیکن وہ جُڑ گیا، اب پھر میرے اندر ٹھہراؤ ہے وقار نسوانی ہے، عزم وضبط ہے، اور یہ آپ کی بدولت ہے، آپ کی ان میٹھی، کڑوی اور زہر میں بجھی ہوئی باتوں نے میرے دل میں آپ کی محبت اور زیادہ کر دی، اور میرے دل کو ایک نئی زندگی سے روشناس کر دیا!"

"جب یہ بات ہے (مسکرا کر) تو میں معافی کیوں مانگوں؟ تمہیں شکریہ ادا کرنا چاہیئے میرا!"

"ہاں میں آپ کی شکر گزار ہوں، بے انتہا شکر گزار، لیکن آپ سے خفا بھی ہوں، اور جب تک آپ معافی نہیں مانگیں گے، میں خوش نہیں ہونے کی ـــــ مانگئے معافی جلدی سے!"

"اچھا بھئی معاف کر دو، تمہارا ہی کہا سہی!"

"گویا میری خاطر سے معافی مانگ رہے ہیں آپ؟"

"اس سے تمہیں کیا معافی مانگ لی، یہی تمہارا مطالبہ تھا!"

"جی نہیں دل سے معافی مانگئے!"

"دل سے معافی مانگتا ہوں، اب تو ہوئیں خوش؟"

"ہاں اب خوش ہو گئی میں!"

یہ کہہ کر اس نے اپنی دونوں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں، ہم دونوں کے لب ایک دوسرے سے قریب ہوتے جا رہے تھے اس نے کہا،

"اور کوئی ہوتا آپ کی جگہ تو ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"کہہ ڈالو ـــــ تو کیا کرتیں تم !"

"میں مار ڈالتی اُسے !"

"میں بھی حاضر ہوں، مار ڈالو مجھے !"

"آپ پر میرا ہاتھ نہیں اُٹھ سکتا، آپ کے لئے اپنی جان دے سکتی ہوں، اپنے لئے آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتی !"

اس کی آنکھوں میں اس وقت وہ چمک لہریں لے رہی تھی، جو صرف سچائی سے پیدا ہوتی ہے، میں نے اپنے لب اس کے لبوں میں پیوست کر دیئے اور پوچھا :

"کیوں ؟"

"آپ کو میں اپنی زندگی بنا چکی، مجھے محبت ہے آپ سے !"

"سچ کہتی ہو ؟"

"جھوٹ کیوں بولوں گی ؟ میں جھوٹ کبھی نہیں بولتی !"

اس عہد و پیمان نے ہمیں پھر جذبات کی دُنیا میں پہنچا دیا، اور سرمستی، بے خودی، اور خود فراموشی کا ایک نیا عالم پھر ہم پر چھا گیا۔

بڑی دیر کے بعد ہم اپنے نشہ سے چونکے۔

میں نے کہا :

یہ بھی عجیب بات ہے ؟ ہمارے تمہارے پینگ اتنے بڑھ چکے ہیں لیکن اجنبیت ابھی تک قائم ہے، تم نہیں جانتیں میں کون ہوں،

میں نہیں جانتا تم کون ہو ؟"

"واقعی عجیب بات ہے، تو پہلے آپ شروع کیجئے ..... کرایئے تعارف اپنا :"

"نہیں پہلے تم :"

"نہیں پہلے آپ :"

"ارے بھئی میں کیا کہوں ؟ ایک چھوٹے سے بینک کا مینجر دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہوں، دن بھر محنت کرتا ہوں، رات بھر تمہیں یاد کرتا ہوں !"

وہ سنتی رہی، میں نے کہا :

"اب تم کہو، تم کیا ہو ؟"

"میرا نام شیریں ہے !"

یہ کہہ کر وہ ذرا رُکی، پھر اس نے کہا :

"رستم سیٹھ میرے شوہر ہیں !"

"(اچھل کر) وہی رُستم سیٹھ جو کروڑپتی سے بھی زیادہ ہیں جن کی داد و دہش کا یہ عالم ہے کہ لوگ حاتم کو بھولے جا رہے ہیں ؟ جو ملک التجار ہیں ؟"

"(طنز کے ساتھ) جی ہاں وہی !"

"لیکن میں نے انھیں کئی مرتبہ بعض جلسوں میں دیکھا ہے، ان کی عمر تو ستر سال کے قریب ہوگی، پھر تم ان کی بیوی کیسے بن گئیں ؟ اور ان سے اتنی بے تعلق کیوں رہیں ؟"

"بری کیسے بن گئی، یہ ایک لمبی داستان ہے، پھر کبھی سُن لیجئے گا۔ اب باقی رہی بے تعلقی، تو میں بے تعلق تو نہیں ہوں ان سے، میں ان کی بیوی ہوں وہ میرے شوہر ہیں، میں ان کے گھر کی ملکہ ہوں، جو چاہتی ہوں خرچ کرتی ہوں جو چاہتی ہوں کھاتی ہوں، جو چاہتی ہوں پہنتی ہوں میری ہر خواہش پوری کی جاتی ہے!"

"پھر ایک معمہ!"

"معمّہ سے آپ کو دلچسپی بہت ہے شاید!"

"بالکل نہیں، میں معمہ سے بہت گھبراتا ہوں، سب کچھ کہہ ڈالو صاحب صاف، سچ سچ!"

اتنے میں کسی نے دروازہ تھپتھپایا، میں نے گھڑی دیکھی چار بج چکے تھے، شیریں نے کہا:

"اب جائیے، زندگی باقی ہے تو کل پھر ملیں گے، باقی داستان کل سنیئے گا!"

میں بادلِ ناخواستہ اُٹھا، شیریں نے دروازہ کھولا، بڑے میاں سامنے کھڑے تھے کہنے لگے:

"چلئے حضرت بہت دیر ہوگئی!"

میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا:

"چلئے!" —— اور ہم دونوں چل پڑے ساتھ ساتھ۔!

—— ★ ——

۱

باب

داستانِ شب

مجھے شیریں سے دلچسپی ہو چلی تھی، اور اس کی باتوں سے بھی دن کاٹنا میرے لئے دوبھر ہوتا تھا۔

شام ہوئی اور میں حسبِ معمول شیریں کے دولت کدہ پر پہنچ گیا مجھے دیکھ کر وہ پھول کی طرح کھِل جاتی تھی، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کسی کنگال کو بہت بڑی دولت ہاتھ لگ گئی،

میں نے کہا:

"ہاں بھئی، اب صبر نہیں ہوتا، کل کی کہانی شروع کرو!"

"بڑی دلچسپی ہے آپ کو اس کہانی سے!"

"مجھے تم سے بھی دلچسپی ہے، اور تمہاری باتوں سے بھی، تم سے اس لئے کہ تم شیریں دہن ہو اور تمہاری باتوں سے اس لئے کہ تم شیریں زبان بھی ہو!"

"واہ واہ! خوب بناتے ہیں آپ لوگوں کو!"

میں نے کہا:

"بالکل نہیں، تم سچ کو مذاق کیوں سمجھتی ہو؟ ——— ہاں بھئی وہ کہانی؟"

وہ سنبھل بیٹھی اور اس نے کہانی چھیڑ دی ———

"میرے والد اسی شہر کی ایک فرم میں تین سو روپیہ ماہوار پر ملازم تھے، اولاد نرینہ سے محروم تھے تین لڑکیاں تھیں، میں سب سے چھوٹی ہوں۔"

ہم لوگوں کا معیار زندگی بلند ہے، کھانا اچھا ہونا چاہیئے، کپڑے قیمتی ہوں، مہمان آجائے تو اس کی خاطر داشت میں کمی نہ ہونے پائے یہ ہے ہمارے گھر کی ریت تین سو روپیہ میں ہمارے والد نے یہ تو کر لیا کہ اپنی بیٹیوں کو ٹھاٹھ سے رکھا، انھیں زیور تعلیم سے آراستہ کیا، لیکن یہ نہ کر سکے کہ ان کے لئے شوہر خرید سکتے!"

"کیا کہا؟ شوہر بھی خریدے جاتے ہیں کہیں؟"

جی ہاں خریدے جاتے ہیں، اور انمول رتن کی طرح بڑے دام ہوتے ہیں ان کے!"

——— "ہاں تو وہ اپنی لڑکیوں کے لئے شوہر نہ خرید سکے، آپ کو شاید اندازہ نہیں، ہمارے دیس میں متعدد فرقے ایسے ہیں، جہاں لڑکیوں کے لئے مردوں کے پیام نہیں آتے، بلکہ مردوں کے لئے لڑکیوں کے پیام بھیجے جاتے ہیں۔"

"ہاں معلوم ہے، بڑی حیرت ہوتی ہے مجھے۔"

"میرے والد نے اپنی لڑکیوں کا پیام کئی گھروں میں بھیجا، اگرچہ ان کی لڑکیاں خوبصورت تھیں، تعلیم یافتہ بھی تھیں، فنون خانہ داری میں تو طاق تھیں، مگر پیام مسترد کر دیئے گئے، صرف اس لیئے کہ میرے والد غریب تھے اور وہ اپنے ہونے والے دامادوں کو ان کی منہ مانگی قیمت نہ دے سکے۔"

"کیا قیمت مانگتے تھے وہ؟"

"ہزاروں روپیہ نقد، ہزاروں کا زیور، ہزاروں کا سامان!"

"کیا جواب دیا تمہارے والد نے؟"

"جواب کیا دیتے؟ کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر خاموش ہو رہے۔۔ ہزاروں کہاں سے دیتے، ان کے پاس تو سیکڑوں بھی نہیں تھے۔"

آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ میری بڑی بہنوں میں سے ایک نے ۳۶ اور دوسری نے ۴۳ بہاریں اس دنیا کی بغیر کسی رفیق زندگی کے دیکھ لیں، ان کا شباب ڈھلتا چلا جا رہا تھا، اور ساتھ ساتھ والد اور والدہ کی زندگی کا آفتاب بھی، دونوں اس غم میں گھلے جا رہے تھے!"

"بات ہی ایسی تھی!"

میں لڑکیوں کے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھی، میرا میٹرک کا سال تھا ایک روز مجھے میری ہیڈ معلمہ نے بلایا، میں اس کے پاس گئی ادب سے بیٹھ گئی۔

اس نے کہا۔

"کل تمہارے اسکول کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا سالانہ جلسہ ہے!"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے!"

"تمھیں بھی تقریر کرنی ہوگی۔"

"میں نے تو کوئی تیاری نہیں کی۔"

(مسکرا کر) "تم تو بلبل کی طرح چہکتی ہو، تمھیں تیاری کی ضرورت ہے؟ دیکھنا ذرا خیال رکھنا، رستم سیٹھ جلسہ کی صدارت کریں گے، ان سے ہماری بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں، ایسی تقریر کرو، کہ تمہاری سہیلیاں مُنہ تکتی رہ جائیں!"

میری پُرانی سہیلی فیروزہ بھی وہاں بیٹھی تھی، بڑی چنچل تھی اس سے ضبط نہ ہوا، وہ مسکرائی اور کہنے لگی:-

"ایسی تقریر کرنا کہ رستم سیٹھ بھی تمہارا منہ دیکھتے رہ جائیں۔"

ہم تینوں ہنس پڑیں، پھر میں باہر جانے کے لئے اُٹھی، انھوں نے پوچھا:-

"کس عنوان پر تقریر کروگی؟"

میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا:-

"مرد اور عورت!"

فیروزہ نے پھر چوٹ کی:-

"بڑا نازک مسئلہ ہے، واقعی رُستم سیٹھ، مُنہ دیکھتے رہ جائیں گے تمھارا!"

میں باہر چلی آئی، اور غیر محسوس طور پر اپنے موضوع کو سوچنے لگی،

دوسرے روز جلسہ ہوا بڑے وسیع پیمانے پر انتظامات کئے گئے تھے،

فیروزہ نے سارے اسکول میں یہ بات اُڑا دی تھی، کہ شیریں "مرد اور عورت"

کے عنوان پر تقریر کرے گی، اسے تو میرا مذاق اُڑانے کا موقع مل گیا تھا، کہتی پھرتی تھی:

"شیریں بڑی مرد شناس ہوگئی ہے، ابھی سے مرد اور عورت پر تقریر کرے گی ایسی کہ اس کی سہیلیاں مُنہ دیکھتی رہ جائیں"!

یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگاتی، اور میں جھینپ کر رہ جاتی،

جلسہ کا وقت ہوگیا، ہال خواتین اور طالبات سے، اور بعض معزز مردوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، رستم سیٹھ صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے،

وہ اپنی عینک سنبھالتے ہوئے کھڑے ہوئے، اُنھوں نے کہا:

اب مس شیریں تقریر کریں گی، ان کا موضوع ہے "مرد اور عورت"

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئے۔ میں اسٹیج پر آئی، صدر کی وجاہت، اور حاضرین کے رعب سے میرے پیر کانپ رہے تھے، میں نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی، کمبخت نظر پڑی تھی تو کس پر فیروزہ پر وہ مسکرائی اور میرے دل پر خیال غالب آگیا، کہ میرا مذاق اُڑا رہی ہے، قریب تھا کہ میں رونے لگوں، مگر رُستم سیٹھ نے میری ہمت بندھائی، بڑی شفقت سے کہا:

"گھبراتی کیوں ہو تم، شاباش، کرو تقریر"

میری ہمت بڑھ گئی، میں نے تقریر شروع کی، شروع شروع میں تو

بے ربط جملے نکلتے رہے، میری زبان سے، لیکن رفتہ رفتہ میں مجمع پر چھا گئی دہشت کافور ہو چکی تھی، اور میں واقعی بلبل کی طرح چہک رہی تھی۔

بڑی کامیاب تقریر رہی میری، تقریر کرکے میں اسٹیج سے اُتری تو ہال اظہارِ مسرت کی تالیوں سے گونج رہا تھا، فیروزہ لپک کر مجھ سے ملی کہنے لگی:

واقعی تیری سہیلیاں تیرا مُنہ دیکھتی رہ گئیں ——— اور رستم سیٹھ بھی!"

میں نے کہا:

" پھر وہی باتیں ——— چپ بیٹھ "

ہم دونوں دوسرے مقرر کی تقریر سننے لگیں۔

اس کے بعد ایک ڈرامہ ہوا۔

" شیریں فرہاد" میں شیریں بنی اور فیروزہ فرہاد، یہ ڈرامہ بھی بہت کامیاب رہا۔

تقریب کے اختتام پر رُستم سیٹھ نے اپنے ہاتھ سے انعامات تقسیم کئے پہلا انعام مجھے ملا اُنھوں نے مجھے مخاطب کرکے کہا:

" مس شیریں! آپ کو پہلا انعام ملا، میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس کمسنی میں اتنی ہونہار ہیں، یہ لیجئے میری طرف سے یہ حقیر تحفہ "

یہ کہہ کر اُنھوں نے ایک نہایت قیمتی طلائی گھڑی اپنے جُھرّیوں والے

بوڑھے ہاتھوں سے میری کلائی پر باندھ دی۔

میں نے شکریہ کے طور پر گردن جھکا دی، جاتے وقت میری اور سیٹھ صاحب کی آنکھیں چار ہوئیں، ان کی بوڑھی آنکھوں میں مجھے جوانی کی ہوس ناچتی ہوئی نظر آئی، میرا جی چاہا، یہ گھڑی ان کے منہ پر کھینچ ماروں، لیکن ضبط کر گئی، اور آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

دوسرا نمبر فیروزہ کا تھا، وہ انعام لے کر جب آئی تو میں نے کہا:

" تو نے سیٹھ صاحب کو اتنا مبہوت کر دیا کہ وہ تجھے اپنی طرف سے کوئی انعام بھی نہ دے سکے، صرف تیرا مُنہ دیکھتے رہ گئے "

بولی" انعام کے قابل تو تم ہو!"

سیٹھ صاحب اسکول کی کارگزاریوں سے بہت خوش ہوئے اپنی جیب سے پندرہ ہزار کی رقم اُنھوں نے اسکول کو مرحمت فرمائی۔

باب ۸
سلسلہ جنبانی

والد کے ایک دوست رستم سیٹھ کے بھی دوست تھے، انھوں نے ایک روز والد سے کہا رستم سیٹھ آج شیریں کی قابلیت اور ذہانت کی بڑی تعریف کر رہے تھے، جب میں نے انھیں یہ بتایا کہ وہ آپ کی لڑکی ہے، تو بہت خوش ہوئے، میرے ذریعہ سے آپ کو مبارکباد بھیجی ہے، اور مع متعلقین کے پیام دعوت بھی، کل آپ سب وہیں رات کا کھانا کھائیں، وہ بہت شکر گزار ہوں گے، شیریں کی ہونہاری سے بہت متاثر ہیں، ممکن ہے یہ دعوت شیریں کے بہترین اور خوش گوار مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہو، والد نے پوچھا:

"وہ کس طرح؟"

"ارے بھئی بات یہ ہے کہ انھیں لڑکیوں کی تعلیم سے بڑی دلچسپی ہے، جانتے ہو آدمی لکھ لٹ ہیں، ابھی حال ہی میں شیریں کے مدرسہ کو ۱۵ ہزار روپیہ جیب خاص سے دے چکے ہیں!"

"واقعی؟"

"ہاں ہاں اور کیا، یہی تو کہتا ہوں شاید شیریں کی تعلیم کا سارا بار اپنے اوپر لے لیں، تم دلا سکوگے اس ہونہار لڑکی کو اعلیٰ تعلیم؟ یورپ بھیج سکوگے اسے؟"

والد ان دلائل کا جواب نہ دے سکے، دعوت اُنھوں نے منظور کرلی دوسرے روز ہم سب رستم سیٹھ کے محل میں پہنچے، بڑے تپاک سے اُنھوں نے ہمارا استقبال کیا، والد کو اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا، ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے، بار بار مجھ سے بھی مخاطب ہوتے تھے، اور کچھ تعلیمی سوالات بھی کرتے تھے، میری حاضر جوابی سے وہ اور خوش ہوئے کہنے لگے والد سے،

"بڑی ذہین لڑکی ہے یہ آپ کی!"

"ہاں لیکن بدقسمت بھی ہے"!

"کیوں یہ کیا کہا آپ نے؟"

"سچ تو کہتا ہوں، غریب ماں باپ کی لڑکی ہے، اور اس دُنیا میں غربت سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہوسکتی ہے؟"

"آپ اس کا خیال نہ کیجئے، شیریں کے جملہ مصارف میں بخوشی اپنے ذمہ لیتا ہوں، ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو آپ کی خدمت میں دو سو روپے پہنچ جایا کریں گے"!

"میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں آپ کا شکر گزار ہوں، لیکن اتنے بڑے

احسان کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا!"

"آپ مجھے شرمندہ نہ کیجئے، میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا اگر آپ میری پیش کش قبول کرلیں گے!"

والد خاموش ہوگئے، میں یہ باتیں سُن رہی تھی، اور شرم سے زمین میں گڑی جارہی تھی، مجھے اپنے والد کی غربت، اپنے افلاس اور اپنے خاندان کی کم مائیگی پر افسوس ہو رہا تھا، سیٹھ صاحب کی یہ سخاوت میرے مُرجھائے ہوئے دل کو کھلا نہ سکی،

دن گزرتے رہے، والد سیٹھ صاحب کے احسان کے بوجھ تلے دبتے رہے، دَبتے دبتے پس گئے، ایک چیونٹی پر اگر پورا پہاڑ کا بوجھ رکھ دیا جائے تو وہ سُرمہ نہیں ہوجائے گی پس کر؟ یہی حال والد کا ہوا، رستم سیٹھ ان پر بہت توجہ کرنے لگے تھے، ان کی ہر مشکل فوراً رفع کردیتے تھے، میری دونوں بہنوں کے لائق و فائق شوہر بڑی گراں قیمت پر خریدے گئے، اس سودے کی ساری رقم پوری سیر چشمی اور اولوالعزمی سے سیٹھ صاحب نے اپنی جیب خاص سے ادا کی،

جانے کیوں میں رستم سیٹھ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی، جتنا میں کھنچتی تھی اتنے ہی وہ جھکتے تھے، میری روکھی باتوں اور پھیکے برتاؤ سے نہ وہ اپنی توہین محسوس کرتے تھے، نہ خفا ہوتے تھے، کچھ ان کا یہ رنگ نیاز دیکھکر اور کچھ ان کی نوازشوں اور احسانوں سے متاثر ہوکر میں اب انھیں زیادہ ماننے لگی تھی، میرے دل میں اب ان کی عزت تھی، محبت تھی عظمت تھی،

انھوں نے ہمارے ساتھ وہ برتاؤ کیا تھا، جس کی اس زمانہ میں توقع نہیں کی جاسکتی اور ظاہر ہے ان کی کوئی غرض ہم سے وابستہ نہیں تھی؛

اپنی بہنوں کو شادکام دیکھ کر، اپنے ماں اور باپ کو بامراد دیکھ کر میں خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی، ہمارے دکھ کا دَور ختم ہوگیا تھا سُکھ کا دَور شروع ہوچکا تھا، وہ سکھ جس میں کوئی کانٹا نہیں تھا، کوئی تلخی نہیں تھی، کوئی اندیشہ نہیں تھا،

والد بُڑھاپے کی وجہ سے اب کام کے قابل نہیں رہے تھے ان کی ملازمت ختم ہوگئی، ہم سب کو بڑا دکھ ہوا، آمدنی کا سوتا بند ہوگیا، اب گھر کی کھیتی کیسے سیراب ہوگی، کیا یہ اَدھ کھلی کلیاں مرجھائیں گی کیا یہ بیل بوٹے سوکھ جائیں گے؟ کیا یہ کہنہ اور بوسیدہ شاخیں جھڑ جائیں گی؟ یہی سوچ رہے تھے۔ میرے والد، کہ پھر ان کے وہی دوست آئے جنھوں نے رستم سیٹھ سے ان کا تعارف کرایا تھا؛ وہ اپنے ساتھ ساتھ ہم سب کی دعوت کی خوش خبری بھی لائے۔

ہم بے تامل سیٹھ صاحب کے خانہ بے تکلف میں داخل ہوئے وہ تو ہمارے لئے چشم براہ تھے ہی، لپک کر اُٹھے، اور بڑے تپاک سے ہم سب کو اندر لاکر بٹھایا، آج والد کچھ خاموش خاموش سے تھے، ہم لوگوں پر بھی غیر محسوس سی افسردگی چھائی ہوئی تھی؛

یہ رنگ دیکھ کر سیٹھ صاحب نے والد سے پوچھا،

"یہ کیا بات ہے؟ آپ کچھ افسردہ سے ہیں!"

کی طرف دیکھا، اور آنکھیں جھکالیں، میں سوچ رہی تھی، یہ شخص آدمی کے روپ میں اوتار ہے، کس بے لوثی سے احسان کئے جارہا ہے، اور اس کے دل پر ذرا بھی گراں نہیں گزرتا۔

کئی مہینے اور گزر گئے، نوکری کے چھٹ جانے کا ہمیں کوئی غم نہ تھا وہی تنخواہ برابر رستم سیٹھ کے خزانے سے والد کو مل رہی تھی بڑے اطمینان اور آسودگی سے گھر کا کام چل رہا تھا، میرے دل میں رستم سیٹھ کی اتنی عزت بڑھ گئی تھی، جسے الفاظ کی مدد سے میں بیان نہیں کرسکتی،

ایک روز میں اسکول سے واپس آئی میں نے دیکھا والد میں اور ان کے پرانے دوست میں کچھ گرماگرم باتیں ہورہی ہیں، میں اوٹ میں ہوکر سننے لگی، وہ کہہ رہے تھے والد سے!

"تو آخر اس میں حرج کیا ہے؟"

"کچھ حرج نہیں ہے؟ شیریں کا اور رستم سیٹھ کا جوڑ بھی ہے کچھ؟"

"ارے میاں جوڑ دیکھو گے یا اپنے خاندان کی زندگی دیکھو گے؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو، دولت مند لوگ کہیں بوڑھے ہوتے ہیں، ان کی جوانی سدا بہار ہوتی ہے، روپیہ سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے، جوانی بھی!"

"اس خیال سے مجھے تکلیف ہوتی ہے"

"دیکھو بھئی میں ہوں تمہارا دوست، تمہارے فائدے کی کہتا ہوں نقصان کی نہیں کہتا، شیریں اگر رستم سیٹھ کی بیوی بن گئی، تو وہی وہ ہوگی اس شہر میں"!

"جی نہیں یوں ہی!"

"کچھ تو کہیئے"

"کوئی خاص بات نہیں"

"عام سہی (مسکراکر) فرمایئے تو؟"

"بھئی فکر مستقبل!"

"اس بڑھاپے میں مستقبل کی فکر؟ خوب رہی یہ!"

سیٹھ صاحب ہنسنے لگے، والد بھی اضطراراً مسکرادیئے، ان کے وہ دوست بولے:-

"ملازمت ختم ہوگئی، یہی سوچ رہے ہوں گے یہ!"

"ملازمت ختم ہوگئی؟ کیوں؟"

"بوڑھے جو ہوگئے ہیں یہ، اب کام ان سے نہیں سنبھلتا!"

"ہاں ٹھیک تو ہے، اب ان کے آرام کا زمانہ ہے!"

"لیکن کھائیں گے کہاں سے؟"

"جب تک میں زندہ ہوں اس کی کیا فکر؟"

یہ کہکر والد سے مخاطب ہوئے:

"کیا تنخواہ ملتی تھی آپ کو؟"

"تین سو"

"یہی تنخواہ ہر مہینہ میں پیش کردیا کروں گا!"

والد کی آنکھوں میں آنسو آگئے، میں نے ممنون نگاہوں سے سیٹھ صاحب

"کیا مطلب ؟"

"لے اب اتنے نادان نہ بنو، خوب جانتے ہو سیٹھ صاحب رنڈوے ہیں، نہ آل نہ اولاد، یہ کروڑوں روپیہ کی جائداد یہ لاکھوں روپے کی آمدنی ہوگی کس کی ؟ شیریں کی، وہ تو آج مرے کل دوسرا دن !"

"نا بھئی یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا !"

"تو کرو فاقے اس بڑھاپے میں "

"کروں گا "

"بڑے احسان فراموش ہو تم "

"کیوں کیا احسان فراموشی کی میں نے ؟"

"یہ احسان فراموشی نہیں ہے تو کیا ہے ؟ جس شخص نے تمہیں نئی زندگی دی، جس نے تم پر پانی کی طرح روپیہ بہایا، جس نے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے تمہاری بن بیاہی لڑکیوں کی شادی کی، جو اب بھی سیکڑوں روپیہ ماہوار تمہیں دے رہا ہے، اس کا دل دکھاؤ گے، اس کی آرزوئیں توڑو گے، اس کی مصیبتوں پر رحم نہ کھاؤ گے، بتاؤ یہ احسان فراموشی نہیں ہوگی ؟ میں تو بھئی ایمان کی کہتا ہوں چاہے بُری لگے یا بھلی!"

اب والد خاموش تھے، ان سے کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک کمرہ میں سناٹا سا چھایا رہا، نہ والد کچھ بول رہے تھے نہ وہ، پھر وہ اُٹھے، انھوں نے کہا۔

"میں اب جاتا ہوں"

"اور بیٹھو کچھ دیر"

"اب جاؤں گا، کل پھر آؤں گا، اسی وقت تمہارا آخری فیصلہ سُننے !"

"اچھی بات ہے جاؤ"

لیکن جاتے جاتے پھر ایک دفعہ کہے دیتا ہوں سوچ لینا اچھی طرح اپنے نفع نقصان کو، یہ موقع ہر کسی کو نہیں ملتا، جو تمھیں مل رہا ہے !"

والد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور وہ چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد میں اندر گئی، میں نے دیکھا، والد مضمحل اور افسردہ سے بیٹھے ہوئے ہیں، اُن کی یہ حالت دیکھ کر دُکھ ہوا مجھے، میں اپنے کمرہ میں چلی گئی، دروازہ اندر سے بند کیا، اور رونے لگی،

ظاہر ہے میں کسی طرح بھی رستم سیٹھ کی بیوی بننے پر تیار نہیں تھی وہ میرے والد سے بھی عمر میں کئی سال بڑے تھے، واقعی میرا ان کا جوڑ کیا تھا ؟ کہاں وہ کہاں میں ؟ ایک ٹوٹی ہوئی، سوکھی ہوئی شاخ پر گلاب کا تروتازہ اور وزنی پھول، یہ کھل سکتا ہے، نہ ٹھہر سکتا ہے،

لیکن یہ معاملہ ایسا نہیں تھا، جسے آسانی سے مسترد کر دیا جاتا، یہ تھا رستم سیٹھ کا معاملہ، وہ رستم سیٹھ جو واقعی میرے، میرے باپ کے میری ماں کے، میری بہنوں کے محسن اعظم تھے، جنھوں نے پانی کی طرح اپنی دولت ہم غریبوں کو نہال اور شاداب کرنے میں بہائی تھی، جنھوں نے ہم بے آسرا لوگوں کو سہارا دیا تھا، جنھوں نے اپنے احسان سے ہمیں اپنا بندۂ بے دام بنا دیا تھا۔

ہوس سہی، حرص سہی، لیکن وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، میرا فرض کیا ہے؟ اپنے جذبات کی تسکین کے لئے اپنے نفس کی آسودگی کے لئے ایسے محسن عظیم کو ٹھکرادوں؟ اگر ایثار کچھ معنی رکھتا ہے، اگر قربانی کا کوئی مفہوم ہے، اگر شکرگزاری کا کوئی مطلب ہے، تو میں اس سے جی کیوں چراؤں کیوں نہ اس احسان کا بدلہ اُتار دوں؟ یہی ہوگا نا کہ میری زندگی سراپا حرمان بن جائے گی؟ بن جائے کیا میں اپنی زندگی کا سکھ قربان کرکے اپنے محسن کا دل نہیں رکھ سکتی؟ اپنے باپ، ماں، اور بہنوں کا کفارہ نہیں بن سکتی؟

اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، میں سوچ رہی تھی، پوری سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو ——— ؟

(صبح ہوگئی، کہانی نامتام رہ گئی)

باب ۹
اَدھوری کہانی

رات بڑے انتظار کے بعد آئی، اور میں اشتیاق اور بیتابی کے جذبات کے ساتھ پھر شبستان شیریں میں پہنچ گیا،

ہم دونوں کی ملاقات کی اصل غایت تقاضائے نفس کی تکمیل تھی لیکن شیریں کی یہ داستان مجھے اتنی سحر انگیز معلوم ہو رہی تھی کہ سب سے پہلے میں اسی کا تقاضا کرتا تھا،

ایک مرتبہ تو وہ جھنجلا گئی، اس نے کہا۔

"اے واہ بالکل بچے بن گئے ہو، ہر وقت کہانی، ہر وقت داستان ——— جاؤ میں نہیں سناتی ——— میں نے تو قصہ چھیڑ کر اپنے سر ایک مصیبت مول لے لی!"

میں نے بڑی مشکلوں سے اسے راضی کیا، بڑی آسانی سے مَن جاتی تھی بیچاری، وہ سنبھل کر میرے پاس بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ میرے بالوں سے کھیل رہے تھے، اور زبان داستان سنا رہی تھی:

بوڑھا مرد کسی جوان چھوکری کو بیوی بنالے، ایسے مواقع پر بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ چھوکری بوڑھے شوہر سے دل سے محبت نہیں کرتی ایسی صورت میں اکثر بدچلنی کا شکار ہو جاتی ہے!

میں نے سوچا یہ کیوں ہوتا ہے؟ صرف اس لیے کہ جوانی اور بڑھاپے کا اتصال جنسیت کی تکمیل میں حارج ہوتا ہے، یہ تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب:

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

آگ اور پانی کا نباہ نہیں ہو سکتا، آگ اور تیل کی خوب بنتی ہے، جوانی جب جوانی سے ملتی ہے تو وہ آگ اور تیل کا روپ اختیار کر لیتی ہے، بڑھاپا جب جوانی کو اپنی گود میں لیتا ہے تو پانی اور آگ کا ملاپ ہوتا ہے۔

میرے دل میں خیال آیا یہ بڑی چھچھوری بات ہے، وہ انسان کیا جو نفس کی آگ پر قابو نہ رکھ سکے، جانور نفس سے بے قابو ہو جاتے ہیں، جذبات کے اس دھارے کو جس کا نام جوانی ہے، جنسیت ہے، نہیں روک پاتے، لیکن انسان تو اشرف المخلوقات ہے کیا وہ بھی ان سفلی جذبات کا غلام ہے؟ ممکن ہے ہو، لیکن میں انہیں ہوں میں نہیں سر جھکا سکتی، ان جذبات کے آگے خواہش نفس مجھے زیر نہیں کر سکتی، جوانی کا تقاضا مجھے بے راہ نہیں کر سکتا، میں نے طے کر لیا کہ میں سیٹھ صاحب کی بیوی بنوں گی، اور دکھا دوں گی دنیا کو کہ جوانی آگ بھی

اس نے کہا:-

میں سوچ رہی تھی، میں رستم سیٹھ کے ساتھ شادی کر لوں گی، میں اگر ان سے وہ محبت نہیں کر سکتی، جو ایک جوان عورت، ایک جوان مرد سے کرتی ہے، تو وہ محبت تو میں کر ہی سکتی ہوں، جو ایک نرس ایک بیمار سے رکھتی ہے، نرس چند روپیوں کی خاطر اپنے مریض کے دکھ سکھ کے لئے وقف ہو جاتی ہے، اپنے راحت اور آرام قربان کر دیتی ہے، میرے خاندان کو تو سیٹھ صاحب نے اتنے سارے روپے دئے ہیں، میں ان کی بہترین نرس بن سکتی ہوں؛

سیٹھ صاحب بڑھاپے کے مرض میں گرفتار ہیں، ہوس کی بیماری نے ان پر حملہ کیا ہے، ان کا نفس اب بھی چنچل ہے، میں ان کی دیکھ ریکھ کروں گی، ان کی خدمت کروں گی، اور ان کی سیوا میں کھو جاؤں گی، ان کے احسانات کا یہی تقاضا ہے، اور میں احسان فراموش نہیں بن سکتی،

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا، لوگوں سے سنا تھا، ہم راز سہیلیوں سے معلوم کیا تھا، دو جوانیاں مل کر محبت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، اور یہ کہ محبت صرف جوانوں ہی میں ہو سکتی ہے، جوانی اور بڑھاپے میں نہیں ہو سکتی۔

اگر دولت، اثر، دباؤ یا مصالح کے ماتحت جوانی کا اور بڑھاپے کا گٹھ بندھن کر بھی دیا جائے، تو محبت قائم نہیں رہتی، یہ تو کبھی نہیں ہوتا کہ جوان مرد کے پلے کوئی بوڑھی عورت باندھ دی جائے، یہی ہوتا ہے کہ

ہے اور برف کی سِل بھی، یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اسے دہکتا ہوا شعلہ بنالیں، یا برف کی سِل! میں جانوروں کی طرح جنسیت کے آگے ہتھیار نہیں ڈالوں گی، میں جنسیت کے طوفان کا مقابلہ کروں گی؛ اور روند دوں گی اسے اپنے پاؤں تلے،

میں کمرے سے ایک عزم مستقل کے ساتھ باہر نکلی، میرا دل مطمئن تھا، وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے رستم سیٹھ کی بیوی بننا ہے،

باہر آئی تو میں نے دیکھا، والدہ سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی ہیں میں ان کے پاس گئی، میں نے کہا،

"کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"یوں ہی کچھ سوچ رہی تھی۔"

"مجھے بھی بتائیے نا!"

"کیا کرے گی پوچھ کر۔"

"ضرور پوچھوں گی میں۔"

"تیرا ہی معاملہ تھا۔"

"کیا؟"

"رستم سیٹھ کا پیام آیا ہے، وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں!"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا

"تو کیا سوچا آپ نے"؟

"یہی فکر تو کھائے جا رہی ہے ہمیں۔"

"آپ اس پیام سے خوش نہیں ہیں؟"

"تو خوش ہے؟"

"خوش نہیں ہوں تو خفا بھی نہیں ہوں!"

"سچ کہہ رہی ہے تو؟"

"ارے میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟"

میں نے دیکھا کہ غم کے بادل چھٹ گئے، ان کے دل کا بوجھ اُتر گیا؛

اس بوڑھی عورت کے چہرے پر خوشی کی کوئی علامت میں نے ایک عرصے سے نہیں دیکھی تھی، آج میں نے دیکھا، اس کے چہرے کی جھُرّیاں گلاب کی پتیوں کی طرح تر و تازہ ہو گئیں، میں ترس گئی تھی، اس بوڑھے چہرے پر خوشی کا نور دیکھنے کو آج اسے خوش دیکھ کر میں کتنی خوش ہوئی اسے صرف میرا دل جانتا ہے!

آہ! وہ چہرہ جو نہ جانے کتنے دنوں سے غم کی آگ میں جھلس رہا تھا؛

باب ۱۰
میاں بیوی

میں رستم سیٹھ کی بیوی بن کر ان کے محل میں آگئی، ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی، وفور مسرت سے وہ جامہ میں نہیں سماتے تھے، مجھے دیکھکر ان کے بوڑھے چہرہ پر جوانی کا رس جھلکنے لگتا تھا، میں ان کے لئے جام شراب تھی، وہ آنکھوں آنکھوں میں پیتے تھے، اور بدمست ہو جاتے تھے!

تین مہینے کی طویل مدت گزر گئی، میں قسم سے کہہ سکتی ہوں، کہ میں نے ایسا پاک دامن آدمی کوئی نہیں پایا، رستم سیٹھ تھے،

ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو بڑائی ہو بیٹیوں کو تاکتے ہیں، جو چکلوں اور کوٹھوں کا طواف کرتے ہیں، جو زن پرستی اور شاہد بازی کو اپنا شغلہ بنا لیتے ہیں، اور ایک مرد رستم سیٹھ تھے، جو اپنی چہیتی اور لاڈلی بیوی کو بھی، عملاً ماں بہن سمجھ رہے تھے، جو اسے بہت چاہتے تھے، لیکن اس سے اس طرح پہلو بچاتے تھے، جیسے کوئی دیندار آدمی کسی فاحشہ

اس طرز عمل پر مجھے حیرت تھی، افسوس نہ تھا، افسوس اس لئے نہیں تھا کہ ان سے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں تھی، اور حیرت اس لئے تھی کہ، یا تو اس شوراشوری یا پایں بے نمکی، آخر انھیں شادی کی کیا ضرورت تھی؟

میں دیکھا کرتی تھی، آج کل سیٹھ صاحب کو ڈاکٹروں اور حکیموں سے بڑی دلچسپی ہوگئی تھی، قیمتی سے قیمتی دوائیں ان کے لئے بن کر آیا کرتی تھیں اور جس طرح ایک شیرخوار بچہ ہمک ہمک کر دودھ پیتا ہے اسی بے صبری سے وہ یہ دوائیں استعمال کرتے تھے، لیکن

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

والا معاملہ تھا، ان کے دل کی کلی کھل نہ سکی، ان کا نخلِ مراد بار آور نہ ہو سکا، وہ جوان نہ بن سکے، اور زیادہ بوڑھے ہو گئے۔

"بڑی عجیب و غریب ہے یہ کہانی!"

"ابھی آپ نے سنا کیا ہے، سنتے رہیئے، پھر آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

ہاں ——— میں نے اس گھر میں جب قدم رکھا تھا، تو اپنی جوانی کو اور اس کے ساتھ جوانی کے ولولوں کو اپنے گھر میں دفن کرکے آئی تھی، میں یہاں برف کی سِل بن کر آئی تھی، لہٰذا قدرتاً مجھے سیٹھ صاحب کی گرم جوشی کا انتظار و اشتیاق نہیں تھا، بلکہ ان کی اس بے بسی سے میں ایک حد تک خوش تھی، کہ جوانی اور بڑھاپے

کے اتصال کا مکروہ نقشہ میرے سامنے پیش نہیں آیا تھا،

میں آگ سے برف بن گئی، یہ سچ تھا، لیکن مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ برف کی سِل پر، چند کمزور چنگاریاں ڈال کر اسے اُبالنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن اب مجھے رُستم سیٹھ کی بے بسی پر رحم آنے لگا تھا، وہ میری نظر میں قابلِ معافی تھے، میں دیکھتی تھی بڑی آس سے وہ نئے نئے حکیموں اور ڈاکٹروں کا تجربہ کر رہے ہیں، اور بڑی یاس سے پھر نسخہ بدلوانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ان کا یہ حال دیکھ کر میرے دل میں رحم کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔

میں ان سے بڑے اخلاق سے ملتی تھی، ایسی میٹھی میٹھی باتیں کرتی اور اس طرح ان کی دلجوئی کرتی تھی، کہ ان کا بارِ غم ہلکا ہو، لیکن میں دیکھتی تھی، میری یہ باتیں ان کے غم کو ——— بے بسی کے غم کو ——— اور بڑھا دیتی ہیں۔

آخر یہ ہوا کہ وہ مایوس ہو جانے کے بعد، مجھ سے خفا خفا سے رہنے لگے مجھ سے ملنا تقریباً انھوں نے ترک کر دیا، میری اس طرح نگرانی کرنے لگے، کہ کیا قیدخانہ میں کسی خونی اور ڈاکو کی کی جاتی ہوگی، شاید وہ سمجھ رہے تھے، میں کسی اور سے ساز باز نہ کروں، لیکن یہ خیال ان کا غلط میں ایسی نہ تھی۔

یہ دَور بھی جلد ختم ہو گیا، نگرانی میری اب بھی ہوتی تھی، لیکن خفیہ

پولیس کے ذریعہ، مجھے بظاہر نہیں معلوم ہوتا تھا، کہ میری نگرانی کی جا رہی تھی، وہ اب پھر مجھ سے ملنے لگے تھے، اور بڑے اخلاق اور نیازمندی کے ساتھ، ان کی اس نیازمندی میں بھیک کا رنگ غالب تھا وہ مجھ سے بھیک مانگ رہے تھے کہ میں انھیں معاف کر دوں، ان کی خطا سے درگزروں، اور ان کی وفادار بیوی بنی رہوں، وہ اب مجھ پر جبر کرنا نہیں چاہتے تھے، چاؤ پیار کی کمند ڈال کر مجھے اسیر دام رکھنا چاہتے تھے، مجھے اس گرفتاری میں کیا عذر ہو سکتا تھا، میں قانع تھی، میں نے طے کر لیا تھا اپنے دل کو کبھی یہ احساس بھی نہیں کرنے دوں گی، کہ میں جوان ہوں اور میری جوانی کچھ چاہتی تھی، کچھ مطالبہ رکھتی ہے، کچھ اُمنگ ہے اس کی۔

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ میں ہر خیال سے پاک تھی، جھوٹ کیوں کہوں، میں جوان تھی، اور جوانی کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا، لیکن میں ہمیشہ کی اصول پرست ہوں، میں نے اس بوجھ کو ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہ دی، خود اس پر غالب رہی۔ اسے اپنے اوپر کبھی غالب نہ آنے دیا، ان عورتوں کی میری نظر میں کوئی عزت نہیں تھی جو اس بوجھ سے دب کر حوصلہ ہار جاتی ہیں، میں ایک مثال قائم کرنا چاہتی تھی، کہ یہ بوجھ اُٹھا کر پھینکا جا سکتا ہے، میں نے اسے اُٹھا کر واقعی کہیں دور بہت دور پھینک دیا تھا، اب یہ میرے پاس نہیں آ سکتا تھا، سیٹھ صاحب میری خاطر داری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے

ایک سعادت مند بچہ جس طرح اپنے والدین کی اطاعت کرتا ہے ایک وفادار نوکر جس طرح اپنے آقا کو پوجتا ہے، یہی حالت سیٹھ صاحب کی تھی میرے ساتھ، میرا ہر اشارہ ان کی مرضی بن جاتا تھا، میری ہر بات ان کے لئے فرمان کا درجہ رکھتی تھی، میری ہر پسند ان کی پسند تھی۔

ان کی اس فروتنی اور انکسار نے میرے دل میں، میرے برتاؤ میں، میرے سبھاؤ میں اور زیادہ نرمی پیدا کر دی تھی، واقعی میں انھیں ایک اوتار کی طرح مانتی تھی، میرے دل میں ان کی محبت تھی، ان کی بے بسی کی مایوسی پر مجھے غصہ نہیں آیا، میری آتشِ نفس تیز نہیں ہوئی میری پھٹی ہوئی جوانی پھٹ نہیں پڑی، جوانی کی دبی ہوئی چنگاریاں دہکتا ہوا انگارہ نہیں بن گئیں، بلکہ میرے دل میں رحم کا سمندر موجیں مارنے لگا۔

مجھے ان سے اپنی ذات کی حد تک کوئی توقع نہیں تھی، پھر بھی مجھے ان سے نفرت نہ تھی، محبت تھی، وہ محبت جو ایک وفادار خادم کو اپنے مہربان آقا سے جو سعادت مند اولاد کو، اپنے محبت کرنے والے والدین سے ہوتی ہے،

وہ میرا رنگ دیکھتے تھے، کبھی خوش ہوتے تھے، کبھی رنجیدہ، ایسے میرے اعزاز و اکرام میں ان کی سرگرمی اور بڑھ رہی تھی، نہ جانے مجھے کیا سمجھ رہے تھے وہ؟

"بہن سمجھ رہے ہوں گے؟"

"توبہ کرو!"

"توڑ کی سمجھ رہے ہوں گے!"

"چھی پھر وہی باتیں!"

——— اتنے میں بڑے میاں پھر نمودار ہوئے اور میں ان کے ساتھ بادل ناخواستہ اس جنت ارضی سے باہر نکلنے پر مجبور ہوا۔

شیریں نے جاتے وقت کچھ نہیں کہا، لیکن اس کی آنکھیں مجھے دعوتِ شب دے رہی تھیں، اس دعوت کو میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں قبول کر لیا۔

باب ۱۱
محبّت بھری باتیں

رات ہوئی اور میں پھر پہنچ گیا، کاشانۂ شیریں میں، آج بھی میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور داستان سرائی کی فرمائش کردی، وہ پھر بگڑ گئی، اس نے کہا:-

اے واہ میں کچھ نوکر ہوں، آپ کی؟ بڑے آئے داستان سننے والے میں نہیں کہتی۔"

میں نے کہا:-

"خفا ہوگئیں تم تو!"

ماتھے پر شکنیں ڈال کر، لیکن ہونٹوں پر تبسم کا جادو پیدا کر کے اس نے کہا:

"جی ہاں خفا ہوں میں آپ سے، پھر کیا کریں گے آپ میرا"

"وہی جو عاشق کرتے ہیں۔"

"اب آپ عشق کا دم بھی بھرنے لگے۔"

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، تم مجھ سے محبت کروگی، تو میں نفرت کس دل سے کروں گا!"

"آپ کو اعتبار ہے میری محبت پر"

"ہوتا جاتا ہے!"

"پتھر میں جونک لگ سکتی ہے، اب میں قائل ہوگئی اس کہاوت کی"

"میں پتھر ہوں۔"

"اچھا خفا نہ ہو جئے، لوہا سہی!"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی، میں نے کہا:

"بھئی اب صبر نہیں ہوتا، سُنا ڈالو اپنی کہانی۔"

آپ لیٹ جایئے آرام سے مسہری پر میں لوری دیتی ہوں، آجائے گی جلدی سے نیند۔"

'آجا ری نندیا آجا'

وہ پھر ہنسنے لگی، آج بہت خوش تھی وہ، شاید اسے میرے دعوئے محبت پر یقین ہو چلا تھا، عورت کس قدر جلد محبت پر ایمان لے آتی ہے۔ ضعیف الاعتقاد کہیں کی،

اسے یہ نہیں معلوم تھا، تسینم میرے دل پر حکومت کر رہی ہے جس طرح عورت ایک بار حکومت کرتی ہے، اور پھر اس کا خزانۂ محبت

خالی ہو جاتا ہے، اسی طرح مرد بھی لاکھ ہرجائی ہو مگر بیک وقت ایک سے زیادہ ہستیوں سے محبت نہیں کر سکتا، تسنیم اگر میرے دل و دماغ پر نہ چھائی ہوتی، تو یقیناً میں شیریں کے آگے سر افگندہ ہو جاتا، لیکن تسنیم کی زلفیں مجھے اس طرح روکے ہوئے تھیں، جس طرح ایک منہ زور گھوڑے کو کوئی بانکا سوار لگام کس کے آگے بڑھنے سے روک لیتا ہے!

میں شیریں سے اس کے جذبات سے کھیل رہا تھا، محبت نہیں کر رہا تھا، لیکن وہ مجھے اپنا عاشق سمجھ رہی تھی، اور خوش تھی، بہت خوش گویا اسے بہت بڑی نعمت مل گئی ہو، دفعتہً مجھے خیال آیا، یہ میں اچھا نہیں کر رہا ہوں، مجھے اگر تسنیم سے محبت ہے تو شیریں کو مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہیئے، میں نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا تھا، کہ وہ گویا ہوئی:

"اچھا کہانی سُنیئے، سُنتے سُنتے سو جایئے گا!"

"ہاں سو جاؤں گا، کہو کہانی"

"اور اگر نہ سوئے تو کیا سزا آپ کی؟"

"سو جاؤں گا"

"وہ کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ نیند اُڑ جائے گی آپ کو"

"تو نہیں سوئیں گے"

"تو ہم کہیں گے بھی نہیں جایئے!"

"عجب مشکل ہے، آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اس نے بڑے نشہ کے ساتھ کہا:

"آپ کی محبت!"

یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگی۔ لیکن اس تبسم میں ایک عجیب کیفیت تھی میں نے اس کا مغالطہ رفع کرنا چاہا تھا، یہ رنگ دیکھ کر اسے میں نے اور گہرا کر دیا، میں نے کہا:

"وہ تو حاصل ہے تمھیں!"

اس کی آنکھوں کی چمک اب شراب بن چکی تھی، اس نے کہا

"لیکن میرا دل دھڑکتا ہے!"

"کیوں؟"

"نہ جانے کیوں؟"

"لاؤ میں اسے بند کر لوں اپنے سینہ میں!"

"کیا آپ کا دل نہیں دھڑکتا؟"

"دھڑکتا ہے، لیکن تمھاری طرح نہیں!"

"اس لئے کہ آپ کا دل زخم خوردہ نہیں ہے!"

"ہے"

"وہ بھی چوٹ کھا چکا ہے؟"

"روز کھاتا ہے"

"کون ہے وہ چوٹ لگانے والا؟"

"ہے کوئی بانکا سپاہی!"

میرے ذہن میں ان باتوں کا مرکز تسنیم تھی، وہ اپنے تئیں سمجھ رہی تھی، میں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا، پھر میرا جی چاہا کہ اس دُکھے ہوئے دل کو دھوکا نہ دوں، لیکن دِل نے کہا، اس دُکھے ہوئے دل کا علاج ہی اب دھوکا ہے، اس دھوکے کی دنیا سے اگر نکالا گیا اسے تو اس کا خاتمہ ہی ہو جائے گا!

"اس نے بڑے رس بھرے لہجہ میں کہا،

"کتنے اچھے ہیں آپ"!

وفورِ محبت سے اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی، اس کے چہرہ پر بیکسانہ نیازمندی کا رنگ جھلک رہا تھا، میں نے کہا:

"میں اچھا میرا دل اچھا، لیکن ان دونوں سے تم اچھی ہو!"

وہ مجسم شراب بن گئی، اس نے ایک ادا کے ساتھ میری طرف دیکھا اور میرے بالوں سے کھیلنے لگی؛ اس نے کہا:

آپ بھی عجیب آدمی ہیں کبھی سر میں تیل بھی نہیں ڈالتے؛ یہ کہہ کر وہ اُٹھی، اور تیل کی شیشی لے آئی، میں نے کہا، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے، مسکرائی، میرے اور قریب آگئی، میرے سر کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر بڑے پیار سے اس نے کہا،

"ہے! مجھے ضرورت ہے اس تکلیف کی!"

یہ کہہ کر بڑے انہماک اور استغراق سے وہ اپنے کام میں لگ گئی

میں نے کہا، افسانہ سُنتے سُنتے میں خود افسانہ بنا جا رہا ہوں، یہ کیا کر رہی ہو تم؟ ارے بھئی شروع کرو نا وہ اپنی داستان!"

بولی!

سُنا دوں گی، ذرا صبر کیجئے، اس کام سے فارغ تو ہو لوں!"

میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا، یہ محبت کی بھوکی ہے اسی لئے محبت لٹانے میں اتنی دریا دلی سے کام لے رہی ہے، وہ میرے سر میں تیل مل رہی تھی، اور میری آنکھوں کے سامنے تسنیم کی تصویر کھڑی مجھے گھور رہی تھی، کہہ رہی تھی یہ ہے عہد وفا؟ یہ ہے شرطِ محبت؟ تم میرے بھی ہو اور شیریں کے بھی؟ جاؤ میں تم سے نہیں بولتی،

شیریں کی نرم و نازک انگلیاں مجھے لوہے کی جلتی ہوئی سلاخ معلوم ہونے لگیں، میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے تیل بھرے ہاتھ پکڑ لئے۔

"بس!"

اس نے پھر بڑے پریم سے کہا:

"ارے تھک گئے آپ؟ میں تو نہیں تھکی"!

یہ کہہ کر وہ میرے سامنے آگئی، میرا دل پھر نرم پڑ گیا، پھر میرے دِل میں اس کی جگہ ہو گئی، میں نے سوچ لیا میں اسے زندگی بھر دھوکے میں رکھوں گا، لیکن اسے یہ کبھی افسوس نہیں ہونے دوں گا

کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا، اس کا ٹوٹا ہوا دل کائنات کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔

میں نے اُسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، اور اس سے کہا:۔

"کان کھول کر سُن لو میری ایک بات!"

"کہئے سُن رہی ہوں!"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں"

وہ اپنا سر میرے زانو پر رکھ کر لیٹ گئی، اس نے کہا:۔

"سچ کہتے ہیں آپ"؟

"تم کیا سمجھتی ہو؟ سچ یا جھوٹ؟"

اس نے ایک سوگوار تبسم کے ساتھ جواب دیا:۔

"سچ سے بھی زیادہ بہت زیادہ!"

پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور ——— ہم اُس وقت چونکے جب بڑے میاں دروازہ تھپتھپا رہے تھے،

باب ۱۲
سوت

پھر رات آئی، ہماری بزم شبینہ جمی، اور شروع ہوگئی وہی ادھوری کہانی:

شیریں نے کہا:

"آج کی داستان بڑی دلچسپ ہے، بڑے شوق سے سنیں گے آپ!"

میں نے کہا:

"میں شوق سے کس دن نہیں سُنتا ہوں؟"

وہ مسکرائی، اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا:۔

"ہمیں تو نیند آرہی ہے آج ابھی سے!"

میں نے جھنجھلا کر کہا:۔

"میری نیند حرام کردی ہے، اب تم سونے نہیں پاؤ گی"

"نہیں بھئی ہم تو سوئیں گے۔"

اور یہ کہہ کر وہ مسہری پر اس طرح دراز ہوگئی جیسے واقعی سو رہی ہے، میں نے اسے گدگدایا وہ اٹھ بیٹھی، اس نے کہا :-

"بڑے شریر ہیں آپ، نہ سوئیں نہ سونے دیں! واہ بھئی، یہ بھی کوئی بات ہے!"

میں نے کہا :

"بات کیوں نہیں ہے، ہمارا اصول تو اس پر ہے کہ

"جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات"

—— اچھا اب باتیں ہو چکیں، شروع کرو اپنی رام کہانی۔"

اس نے کہا سُنئے :-

"رستم سیٹھ کا ایک منہ چڑھا ملازم تھا، بختاور چوڑا چکلا سینہ ورزشی جسم، بڑی بڑی آنکھیں، بھرے بھرے بازو، لوگ کہتے ہیں جوانی عورت پر پھٹی پڑتی ہے" لیکن میں نے بختاور پر بُری طرح جوانی پھٹی پڑتی دیکھی، ہر وقت اودھایا سا رہتا تھا، نوکروں اور نوکرانیوں کا تو اس سے ناک میں دم تھا، کسی کے چٹکی لے لی، کسی کو دیکھ کر منہ چڑا دیا، کسی کے بے سان وگمان چانٹا لگا دیا، سب اس کے ویل تھے اس لئے کہ وہ سیٹھ کا منہ چڑھا تھا، جسے چاہے معزول کرا دے، جس سے خفا ہو، خود برخاست کر دے، جس سے خوش ہوا اسے ملازم رکھ لیا بڑے وسیع اختیارات اسے حاصل تھے سیٹھ صاحب

کی طرف سے،

میں نے دیکھا بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے، مگر کیا مجال جو سیٹھ صاحب اسے ترچھی نظر سے دیکھ لیں، اور کسی دوسرے نوکر سے دو پیسے کا نقصان بھی ہو جائے تو اس کی تنخواہ کٹ جائے۔

میں جب شروع شروع میں یہاں ان کی بیوی بن کر آئی اور مجھ پر صدقے قربان ہونے لگے، تو میں نے دیکھا بختاور کچھ سُست سُست رہتا تھا، کچھ افسردہ تھا، مضمحل سا، سیٹھ صاحب کی ساری توجہ مجھ پر صرف ہو رہی تھی، ایک ملازمہ سے مجھے معلوم ہوا، بختاور مجھ سے جلتا ہے، میں نے پوچھا:

"یہ کیوں؟ میرا اس کا کیا مقابلہ؟

کہنے لگی :-

آپ نہیں جانتیں، ہم جانتے ہیں"

"تو مجھے بھی بتاؤ نا"

"اور جو بتانے والی بات ہی نہ ہو؟"

"مجھے غصہ آگیا، میں نے کہا، یہ بات تجھے بتانی پڑے گی، اگر نہ بتائی تو نے تو میں بُری طرح پیش آؤں گی۔

وہ سہم گئی اس نے کہا.

"میں بتا تو دوں، لیکن اگر سیٹھ صاحب کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا؟

میں نے کہا :-

"نہیں پتہ چلے گا انھیں صاف صاف کہہ دے، جو کچھ تجھے معلوم ہے"

وہ بولی :-

"سیٹھ صاحب اسے چاہتے تھے، اس سے دبتے تھے، اب اکھڑے اکھڑے ہیں، اس لئے جلتا ہے یہ تم سے"

میں حیران ہوگئی، میں نے بڑے تعجب سے پوچھا :-

"وہ اسے چاہتے تھے، اس سے دبتے تھے؟ یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟ کچھ پی تو نہیں گئی ہے؟"

وہ مسکرائی کہنے لگی :-

"اے واہ! یہ کیوں پینے لگی، وہی دونوں پیتے ہیں ساتھ مل کر، بڑے چاؤ پیار سے!"

میں نے دریافت کیا :-

"آخر انھیں کیسی محبت ہے اس سے؟ وہ کس لئے دبتے ہیں اس سے؟"

"اب میں کیا کہوں؟ کہا بھی تو نہیں جاتا"

"کہنا پڑے گا ——— اگر نہ کہا تو نے تو ابھی میں سیٹھ کو بلا کر ان سے پوچھوں گی، اور کہہ دوں گی کہ تو یہ کہہ رہی تھی"

دہشت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، گھبرا گئی اور کہنے لگی :-

ہاتھ جوڑتی ہوں، ان سے کچھ کہنا نہیں تو میری خیر نہیں ہے"

"پھر بتا دے سچی سچی بات!"

"عادت ہے سیٹھ صاحب کی"

"کیا عادت ہے؟"

"سنڈے سنڈے نوکروں کو رکھتے ہیں، انھیں کھلاتے پلاتے ہیں، اور جانے ان سے کیوں دبتے لگتے ہیں؟ کہ وہ پھر ان کا ادب بھی نہیں کرتے، منہ چڑھ جاتے ہیں، بعض تو دھمکی بھی دینے لگتے ہیں، اور سیٹھ صاحب سہم جاتے ہیں ان سے، سُنی کی اَن سنی کر دیتے ہیں منہ مانگا انعام دیتے ہیں"

"سچ کہہ رہی ہے تو؟"

"ہاں ہاں سچ بالکل سچ"

"تجھے کیسے معلوم ہوا"؟

"یہ تو کسے نہیں معلوم ہے؟ گھر بھر تو جانتا ہے یہ باتیں"

مجھے ہول سی معلوم ہونے لگی یہ باتیں سُن کر، پھر میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا وہ چلی گئی اپنے کام پر، اور میں سوچنے لگی:

میں نے دماغ پر زور دیا تو مجھے وہ باتیں یاد آنے لگیں، جنھیں پہلے میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی، مگر اب وہ ایک خلش بن کر میرے دل میں کھٹکنے لگی تھیں۔

میں اپنی توجہ ان باتوں سے ہٹا لیتی، لیکن نئی نئی باتیں سامنے آ رہی تھیں،

رستم سیٹھ نے نہ جانے کتنا سونا کھا ڈالا، نہ جانے کتنے موتی چبا ڈالے ہر دوا کر ڈالی، مگر ان کی جوانی کی سوکھی ہوئی کھیتی سرسبز نہ ہو سکی وہ مایوس ہو گئے، میں کہہ چکی ہوں، ان کی مایوسی نے برہمی کا رنگ اختیار کر لیا تھا اب وہ مجھ سے الگ الگ بھی رہتے تھے، اور خفا خفا بھی، حالانکہ میری کوئی خطا نہیں تھی، وہی مجھے بیاہ کر لائے تھے، لیکن نہ جانے کیوں انھیں رہ رہ کر اب مجھ سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔

مجھ سے تو ان کا یہ حال تھا، اور بختاور پھر خوش خوش رہنے لگا تھا، وہ پھر اب ان پر حکومت کر رہا تھا، اب مجھے ملازمہ کی باتوں کی روشنی میں سیٹھ صاحب اور بختاور کے تعلقات پر غور کرنے کا موقع ملا، تو میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ سیٹھ صاحب واقعی اس کا بہت خیال کرتے ہیں، اس سے دبتے بھی ہیں، اس کا لحاظ بھی بہت کرتے ہیں، یہ معمول تھا کہ سیٹھ صاحب اُس وقت تک نہیں سوتے تھے جب تک ان کے کوئی پاؤں نہ دبائے، اور یہ خدمت بختاور کے ذمہ تھی وہ وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں گئے، اور پیچھے پیچھے بختاور پہنچا وہ اس کی کوئی خواہش رد نہیں کرتے تھے، ابھی اس نے شادی کی تو پانچ ہزار روپیہ اسے سیٹھ صاحب نے دے دیا، اس کی بیوی کو بیٹی بنایا، اور اسے بھی بہت کچھ دیا، گھر کی بوڑھی نوکرانی نے اپنی جوان لڑکی کی شادی کے لئے سو روپیہ مانگے، تو صاف انکار کر دیا،

اب ہر وقت سیٹھ صاحب اور بختاور کی جوڑی بنی رہتی تھی، جب تک سیٹھ صاحب مجھ سے الگ تھلگ رہے، مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی، میں ان کی مجبوریوں سے واقف تھی، مجھے ان پر غصہ نہیں تھا، رحم آتا تھا، لیکن اب ان کے اور بختاور کے تعلقات کا یہ رنگ جو میں نے دیکھا، تو مجھے واقعی جلن ہونے لگی بختاور کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا، میں اس سے اتنا ہی جلتی تھی، جتنا کہ کوئی پرانی بیوی اپنی کسی نئی نویلی سوت سے جلتی ہے،

شیریں کے یہ الفاظ سُن کر میں ہنسی نہ ضبط کر سکا، میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"تم نے بختاور کو اپنی سوت بنا لیا؟ بڑی عقلمند ہو!"

"پھر آپ بیچ میں بولے؟ چپ چاپ سنتے رہیئے! نہیں تو میں نہیں سُناؤں گی داستان جائیے!"

میں نے کہا:-

"اچھا بھئی نہیں بولیں گے بیچ میں، کہانی ہے بڑی دلچسپ کہے جاؤ۔"

اس نے پھر سلسلہ شروع کیا اپنی داستان کا:-

میں نے رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا کہ بختاور بری طرح سیٹھ صاحب پر حاوی ہوتا چلا جا رہا ہے، سیٹھ صاحب اس سے اس طرح دبتے تھے،

جس طرح پُرانے زمانے کی بیویاں اپنے شوہروں سے دبا کرتی تھیں اور وہ انھیں اس طرح دباتا تھا، جس طرح گنوار اور جاہل شوہر اپنی بیویوں کو شیر کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں، سیٹھ صاحب کی یہ بیکسی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی رہ رہ کر مجھے غصہ آتا تھا سیٹھ صاحب پر،

کچھ روز بعد میں نے دیکھا، نہ معلوم کیوں نجتاور سیٹھ صاحب سے خفا ہو گیا نہ کھانا کھاتا ہے، نہ سیٹھ صاحب کے پاؤں دبانے جاتا ہے، اور کوئی ایسی گستاخی کرتا تو سیٹھ صاحب اُسے سزا بھی دیتے، اور حساب بھی صاف کر دیتے لیکن نجتاور کا معاملہ دوسرا تھا،

خود سیٹھ صاحب کا کھانا بھی چھوٹ گیا، رات کی نیند اُڑ گئی بڑے پریشان رہتے تھے وہ، ایک روز میں نے دیکھا سیٹھ صاحب کے کمرہ میں نجتاور ایک کرسی پر بیٹھا ہے، اور سیٹھ صاحب اس کے پاس زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں، وہ اسے منا رہے ہیں، خوشامد کر رہے ہیں، مگر وہ مُنہ پھُلائے ہوئے ہے، سیدھے مُنہ بات بھی نہیں کرتا، بڑی دیر کے بعد اس نے کہا:

"مجھے تو دس ہزار چاہئیں"

سیٹھ صاحب نے تجوری کھولی، اور دس ہزار کے نوٹ اسے گن دئے، پھر بڑے پیار سے کہنے لگے:

"تو میری ساری دولت لے لے، لیکن مجھ سے خفا نہ ہوا کر"

وہ مردانہ تیوروں سے ہنسا، اس نے ایک اکھڑ شوہر کی طرح اپنی عاشق زار

بیوی کو یقین دلایا،

"اب کاہے کو خفا ہوں گا میں!"

یہ خوشخبری سُن کر سیٹھ صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ مسکرانے لگا،

اسے خوش دیکھ کر سیٹھ صاحب بھی باغ باغ ہو گئے۔

مجھے بڑی حیرت تھی، یہ ماجرا کیا ہے؟ بات کیا ہے؟ سیٹھ صاحب اتنے اس پر فریفتہ کیوں ہیں؟ اس سے اتنے سہمے ہوئے کیوں ہیں؟

کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا، البتہ غصہ آگیا مجھے، لیکن یہ موقع غصے کا نہیں تھا، پی گئی، اور ٹل گئی موقع واردات سے،

شام کو میری اور سیٹھ صاحب کی مُڈبھیڑ ہو گئی، میں نے انھیں ٹوکا:

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں"

"کہو"

"یہ آپ کا کیا رنگ دیکھ رہی ہوں میں؟"

"کیا رنگ دیکھا تم نے میرا؟"

"یہ نجتاور کون ہے؟"

"میرا نوکر"

"پھر آپ اس سے دبتے کیوں ہیں؟ اس کی خوشامد کیوں کرتے ہیں وہ گستاخ کیوں ہے؟"

سیٹھ صاحب کا چہرہ اُتر گیا، رنگ اُڑ گیا وہ گھبرا گئے، ہکا بکا ہو گئے، لیکن سنبھلے، اور پہلی مرتبہ تیکھی نظروں سے مجھے دیکھ کر ترش روئی کے ساتھ کہا:

"جن معاملات سے تمہارا تعلق نہیں، ان میں تم کیوں دخل دیتی ہو؟ تمہیں اس سے کیا؟"

اس جواب کی مجھے ان سے ہرگز توقع نہیں تھی، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، اُنھوں نے توجہ بھی نہیں کی اور کہیں باہر چلے گئے!

ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں لیٹ کر بہت دیر تک رویا کی، لیکن رونے سے ذرا بھی تسکین نہ ہوئی۔ دل بہت گھبرا رہا تھا!

باب ۱۳
جوار بھاٹا

میں اب تک اس گھر میں ایک ملکہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ میری چشم وابرو کا اشارہ آخری فیصلہ سمجھا جاتا تھا، میرا دل یوں مطمئن تھا، کہ میں سمجھتی تھی میں ایثار کر رہی ہوں، میں نے اپنے شباب کو اور اس کے تقاضوں کو، جوانی کو اور اس کی رنگینیوں کو، آرزوؤں کو، اور ان کے طوفانوں کو، اتنی ساری، اور اتنی بڑی چیزوں کو الف لیلےٰ کے اس بڑے جن کی طرح اپنے چھوٹے سے سینہ میں بند کر کے حبس دوام کی سزا دے دی تھی، جو خود ایک چھوٹے سے لوٹے میں دھواں بن کر سمایا گیا تھا، سیٹھ صاحب کو دیکھ کر میں اپنی حرماں نصیبی پر روتی نہیں تھی، کڑھتی نہیں تھی، فخر سے اپنا سر اونچا کر لیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا وہ ایک بھکاری بن کر میرے سامنے گڑگڑاتے ہوئے آئے اور میں نے

ان کے کشکول میں بڑی سیرچشمی اور اولوالعزمی سے اپنی زندگی ڈال دی لیکن اب احساس فخر کی یہ نعمت بھی مجھ سے چھینی جا رہی تھی، اب تک وہ بھکاری تھے، اور میں دھن وان، اب میں ان کے رحم کرم پر تھی، وہ مجھے جب چاہیں جھڑک سکتے تھے، ڈانٹ سکتے تھے۔

میرے دل میں پھر آرزوؤں کا طوفان اُٹھا، میں نے سوچا میں بھی کیوں نہ من مانی زندگی بسر کروں، بہتے نگوں جوانی کے دھارے پر، اور چھوڑ دوں اس بُڈھے کی ٹوٹی ہوئی ناؤ کو منجھدار میں، اب میرے دل میں بغاوت سرکشی اور خودمختاری کا جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا، میں سوچ رہی تھی، میں نے صرف اس بوڑھے کا دل رکھنے کے لئے اپنی زندگی برباد کرلی، اپنے شباب کا خون کرلیا، لیکن جب اس کا صلہ مجھے اس بے رُخی، اور خودغرضی کی صورت میں مل رہا ہے، تو کیوں نہ میں دھتا بتادوں اس بوڑھے خُرّانٹ کو اس کا آفتاب زندگی لب بام پہنچ چکا ہے، اور میری جوانی کا سورج نصف النّہار پر ہے، یہ ڈھلتی چھاؤں ہے، اور میں چڑھتی دھوپ، یہ سوکھی ہوئی شاخ ہے جس کا علاج یہی ہے کہ نخلِ ہستی سے جُدا کر دیا جائے، اور میں تروتازہ پھول ہوں، جس کی مہک سے جوانی کے دل انگڑائیاں لے لے کر میرے قدموں پر سربسجود ہو سکتے ہیں اسے جب اپنی ناک کی پرواہ نہیں تو میں کیوں اس کی رکھوالی کروں؟ کیوں نہ اسے اپنی سرشار جوانی کے تیز

بستر سے کاٹ دوں؟ اور ہو جائے یہ بخیا؟ دُنیا اسے دیکھے تو نفرت سے منہ پھیر لے،

پھر میں سوچنے لگی، یہ ہوس پرست بوڑھا، میرے ماں باپ کا محسن ہے مجھ پر اس کے احسانات ہیں، اسی کی سیرچشمی کی بدولت میری بہنیں سکھ کی زندگی بسر کر رہی ہیں"

یہ نہ ہوتا تو آج میرے باپ کو فاقے ہو رہے ہوتے، کون آدمی ہے، جس میں صرف نیکیاں ہوں بُرائی ایک بھی نہ ہو؟ اس کی اتنی ساری نیکیوں پر، اس کی ایک بیرخی اور ترش کلامی سے پانی کیوں پھر جائے؟ ایثار کی تعریف یہ ہے کہ وہ داد طلب نہ ہو، میرے ایثار کی داد اگر مجھے نہیں مل رہی ہے تو بھی میرا فرض ہے کہ میں ایثار کئے جاؤں، جس ایثار کے استقبال کے لئے دیدہ و دل فرش راہ ہوں وہ ایثار نہیں کاروبار ہے، جو ایثار بے رُخی اور تلخی کے سایہ میں پروان چڑھے وہ ہے سچا ایثار، میں اگر واقعی ایثار کرنا چاہتی ہوں تو مجھے یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیئے کہ سیٹھ صاحب میرا خیال کرتے ہیں یا نہیں وہ مجھے بالکل نہ مانیں، جھڑکیں، ڈانٹیں، مُنہ نہ لگائیں، میری خبر نہ لیں اپنے خزانہ کا دروازہ میرے لئے بند کر دیں، پھر بھی مجھے ان کی خدمت کرنی چاہیئے ان کا خیال رکھنا چاہیئے، پھولوں کی سیج پر بیٹھ کر سونے چاندی کے برتنوں میں اچھے اچھے کھانے کھا کر ریشم کی گٹھریوں میں بندھ کر میرے

جواہرات کے زیور پہن کر جو ایثار کیا جائے وہ چاہے جو کچھ ہو ایثار ہرگز نہیں ہے، اب تک مجھے یہ چیزیں حاصل تھیں، اور میں ایثار کر رہی تھی تو گویا اپنے ایثار کو بیچ رہی تھی، اس سودے سے مجھے ہاتھ اُٹھا لینا چاہیئے، کانٹوں کے بستر پر میں سوؤں مٹی کے برتنوں میں روکھے پھیکے کھانے کھاؤں، پھٹے پُرانے کپڑے پہنوں، میٹھی باتوں کی بجائے کڑوی کسیلی باتیں سنوں، اور پھر بھی ایثار کرتی رہوں تو ہے ایثار، اس طرح تو میں ایثار اور خدمت کا منہ چڑا رہی ہوں، چھی چھی،

اب پھر میں خوش خوش رہنے لگی تھی، میں نے اپنے دل سے یہ خیال نکال دیا تھا، کہ سیٹھ صاحب سے میں کوئی اُمید رکھ سکتی ہوں، اور اس خیال پر اٹل ہو گئی تھی، کہ دکھ سکھ جو بھی قسمت میں لکھا ہو، اس کی پروا نہیں مجھے اس گھر میں رہنا ہے، ایک خدمت گزار ــــ بے زبان خدمت گزار کی حیثیت سے ــــ

سیٹھ صاحب کیا کرتے ہیں؟ وہ گھر میں رہتے ہیں یا باہر؟ بختاور کے اور اس کے مراسم کی نوعیت کیا ہے؟ ملازم ان دونوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ اور اصل واقعہ کیا ہے؟ ان سب باتوں کو میں نے یکسر اپنے دماغ کے پردہ سے نکال باہر کر دیا تھا میں ان باتوں کو سوچنے سے بھی گریز کرتی تھی۔

ایک روز میں آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنے بالوں کو درست کر رہی تھی، کہ سیٹھ صاحب آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں سنبھل کر

بیٹھ گئی، اُنھوں نے بیٹھتے ہوئے پیار کے لہجے میں کہا:۔

"کچھ خفا ہو شیریں؟"

"آپ خفا ہونے والی کوئی بات کرتے ہی نہیں، پھر میں کیوں خفا ہونے لگی۔"

کہنے لگے:

"نہیں تم چھپاتی ہو، ضرور خفا ہو، اور تمہیں میں خوش کر کے رہوں گا!"

میں نے کنگھی کرتے کرتے اور آئینہ کی طرف منہ کئے ہوئے جواب دیا:۔

"آپ تو خواہ مخواہ کی باتیں کر رہے ہیں، کون سا سکھ ہے جو مجھے آپ کے گھر میں نہیں حاصل ہے؟ اس سے بڑھ کر خوشی کی بات میرے لئے آخر اور کیا ہو سکتی ہے؟"

وہ کچھ دیر چپ رہے، پھر انھوں نے کہا:

"عورت صرف جسم کا سکھ ہی تو نہیں چاہتی، دل کا سکھ بھی تو اس کے لئے ضروری ہے، کیا میں نہیں جانتا یا باتیں؟"

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اور وہ پھر خاموش ہو گئے اب پھر میرے دل میں مہر مادری لہریں لینے لگی ــــ (ہنس کر) سچ مذاق نہیں، میں ان سے وہی محبت کر سکتی تھی جو ایک ماں ایک بیٹے سے کرتی ہے، اس میں ہنسی کی کیا بات ہے، آپ ہنسنے کیوں لگے؟ ــــ ہاں تو ان کی یعنی محسنِ اعظم کی یہ حالت

مجھ سے نہ دیکھی گئی، میں نے کہا،

آپ تو مفت کا رنج مول لیتے ہیں، مان لیا عورت دل کا سکھ بھی چاہتی ہے، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جسم کا سکھ جسے بہت زیادہ حاصل ہو، وہ دل کے سکھ کی کچھ زیادہ پروا نہ کرے، کم از کم میری یہی کیفیت ہے میں جس دن یہاں آئی تھی، بلکہ جس دن اپنے ماں باپ کے سامنے میں نے اس رشتہ کو قبول کیا تھا، اسی دن میں نے سوچ لیا تھا، کہ اس دل کے طلسم کو توڑ کر رہوں گی، خواہ مخواہ لوگوں نے ایک اوہم بچا رکھا ہے، دل یہ ہوتا ہے، اور وہ ہوتا ہے، یہ کرتا ہے اور وہ کرتا ہے، یوں اس میں طوفان اُٹھتے ہیں، اور اس طرح اس میں بڑی بڑی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی لہریں اُٹھتی ہیں، مجھے تو ان مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے بھی سامنا نہیں پڑا، دل آخر اپنا ہی دل ہوتا ہے کسی غیر کا تو نہیں ہوتا پھر وہ آپے سے باہر کیوں ہو؟ اگر ہونا بھی چاہے تو اُسے اس کی اجازت کیوں دی جائے؟

کہنے لگے:

"میں نہیں مانتا ان باتوں کو" اب مجھے غصہ آ گیا، میں نے کہا:

کیوں نہیں مانتے آپ؟ کیا وجہ ہے آپ کے پاس نہ ماننے کی؟ آپ عورت ذات کی توہین کر رہے ہیں، اپنے دیس کو بدنام کر رہے ہیں میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں، مگر عورت ذات کی توہین نہیں برداشت کر سکتی، اپنے وطن کی بُرائی نہیں سُن سکتی!"

وہ بھی جھنجلا گئے، تیوریاں چڑھا کر بولے:

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں نے عورت ذات کی توہین کب کی؟ اپنے وطن کو بدنام کیسے کیا؟"

"آپ کی باتوں کا صاف مطلب یہ ہوا کہ آپ عورت پر بھروسہ نہیں کرتے، اسے اعتبار اور اعتماد کا اہل نہیں سمجھتے، اس کی جوانی کو ناقابل برداشت سمجھتے ہیں!"

"تو اس سے کیا؟"

ہمارے دشمن بھی اسے مانتے ہیں کہ ہندوستان عفت و عصمت اور پاکیزگی کا سرچشمہ ہے، یہاں نہ جانے کتنی عورتیں ہر سال بیوہ ہو کر ساری جوانی بیوگی میں کاٹ دیتی ہیں اور کبھی بدراہ نہیں ہوتیں، جس آن سے اس دیس کی عورتیں، جوانی کے طوفانوں کا عصمت کی چٹان بن کر مقابلہ کرتی ہیں، وہ انھیں کا حصہ ہے پھر آپ بجائے اس کے کہ ان کے آگے، عقیدت کی گردن جھکائیں. ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔؟"

"تم تو ابھی بیوہ نہیں ہو، گفتگو تو تمہارے بارے میں تھی!"

بہت سی عورتیں ہیں جن کے شوہر زندہ ہیں لیکن وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتے، وہ اپنے نت نئے مشغلوں میں مگن رہتے ہیں لیکن ان کی بیویاں گمراہ نہیں ہو جاتیں، بدمعاشی اور آوارگی کو اپنا پیشہ نہیں بنا لیتیں، شوہر کے نام پر اپنی ساری جوانی کاٹ دیتی ہیں!"

ڈال دیا جائے جس سے انھیں دل کا سکھ مل سکے، میرے خیال میں دل کے سکھ کا بہترین ذریعہ خدمت ہے اور کچھ نہیں!"

میری باتوں سے وہ بہت متاثر ہوئے کہنے لگے:۔

بڑا مبارک مقصد ہے تمہارا۔ میں ہر مدد کے لئے تیار ہوں لیکن کیا تم عقد بیوگان کی مخالف ہو، تمھاری اسکیم میں ایک دفعہ ایسی بھی ہونی چاہیئے کہ اگر کوئی بیوہ عقد کرنا چاہے، تو اس کی شادی کا بندوبست کر دیا جائے، بلکہ اسے ترغیب دی جائے کہ وہ شادی کرلے، اور اگر وہ شادی پر راضی نہ ہو، تو دوسری بات ہے پھر خواہ وہ نرس بنے، یا کوئی اور خدمت انسانی اپنے ذمہ لے لے؟"

"میں نے کہا:

میں عقد بیوگان کی مخالف نہیں ہوں، جو بیوائیں شادی کرنا چاہیں انھیں کسی تربیت گاہ کی ضرورت نہیں ہے، میں تو یہ ادارہ صرف ان عورتوں کے لئے کھولنا چاہتی ہوں جو اپنی نوجوان بیوگی کا زمانہ خدمت نفس کے بجائے خدمت خلق میں بسر کرنا چاہتی ہیں، وہ آئیں علم و ہنر حاصل کریں، اور خدمت کو اپنا پیشہ بنالیں"۔

بہت خوش ہوئے سیٹھ صاحب ان باتوں سے، میری پیٹھ تھپکی انھوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے پھر فرمانے لگے:

"ضرور قائم کرو، ایسا ایک ادارہ بڑا نیک مقصد ہے، میں اس

اب سیٹھ صاحب بہت مدھم پڑ گئے۔ انھوں نے کہا:۔

"تم تو خفا ہوگئیں، میں تو تمہارے حوصلہ کی تعریف کر رہا تھا!"

پھر انھوں نے کہا:۔

"واقعی جس ایثار کا ثبوت تم نے دیا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے، میں نے غلطی کی، مجھے شادی نہیں کرنی چاہیئے تھی!"

ان کی آواز لرزنے لگی ـــــ میرا دل نرم پڑ گیا، میں نے کہا:۔

"ایسی باتیں کر کے آپ اپنا اور میرا دل کیوں دکھاتے ہیں؟ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، اور میں سمجھتی ہوں اچھا ہی ہوا، پھر اس کا رونا کیوں رویا جائے، مزے میں گزر رہی ہے ہم دونوں کی زندگی، ہم اس مزے کو خواہی نخواہی کا غم مول لے کر کر کرا کیوں کریں؟ کیا عورت کا کام صرف یہی ہے کہ وہ جوانی کے مزے لوٹے، اس کا مقصد بہت بلند ہے، خدمت انسانیت کی خدمت، یہ مقصد ایسا ہے، کہ اگر اس میں لگ جائے تو پتہ بھی نہیں چل سکتا، جوانی کب بڑھاپے میں بدل گئی"

"تم نے کونسا راستہ خدمت کا منتخب کیا ہے؟"

ہماری سماج میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ عورت کا بالخصوص نوجوان بیواؤں کا ہے۔ میں ایک ایسی تربیت گاہ کھولنا چاہتی ہوں جس میں ہر قوم اور مذہب کی بیوہ لڑکیاں داخل کی جائیں، انھیں تعلیم دی جائے، ہنر سکھایا جائے، نرس بننے کی ترغیب دی جائے اس طرح ان کی خدمت کا جذبہ اُبھارا جائے، اور انھیں ایک ایسے راستہ پر

کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کردوں گا۔

میں مسکرائی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے کہا:۔

"شکریہ!"

انھوں نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا اگر اس وقت تھوڑی دیر کے لئے انھیں کہیں سے جوانی مل جاتی تو میری ہڈی پسلیاں برابر کر دیتے، لیکن صرف دیکھ کر رہ گئے۔"

باب ۱۴
نو وارد

اُس دن کی باتوں کے بعد سے سیٹھ صاحب بالکل بدل گئے تھے اب وہ پھر میرے پجاری تھے، گھنٹوں میرے پاس بیٹھے رہتے اور دل جوئی کی باتیں کرتے،

کلکتہ میں ان کے کچھ عزیز تھے، کبھی کبھی ان کا ذکر ہوتا رہتا ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگے، کلکتہ میں میرا ایک ہونہار اور نوعمر عزیز جمشید ہے، اسی سال اس نے میڈیکل کالج سے ڈگری لی ہے یہاں پریکٹس کرنا چاہتا ہے، ہمارا کیا جائے گا، مفت کا ڈاکٹر مل جائے گا بلالوں؟

سیٹھ صاحب لکھ لٹ اور دولت مند ہونے کے باوجود مفت کا مال چھوڑتے بھی نہیں تھے، میں نے کہا:۔

"ہاں کوئی حرج نہیں بُلا بھیجئے"

چند روز کے بعد ایک خوبرو اور خوش اندام نوجوان کو لے کر سیٹھ صاحب میرے پاس آئے، کہنے لگے "یہ ہے جمشید میں بڑھ کر لی وہ

بھی گرم جوشی کے ساتھ آگے بڑھ کر مجھ سے ملا؟

ایک کمرہ صاف کرایا گیا، اور جمشید وہاں رہنے لگا، اس کے آجانے سے ہمارے گھر میں ایک ایسا اضافہ ہوگیا، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا،

نہ معلوم مطب میں کس طرح جمشید سنجیدگی سے بیٹھتا ہوگا، گھر میں تو وہ سراپا شوخی اور زندہ دلی کا مجسمہ بنا رہتا تھا، بہت جلد وہ سب سے بے تکلف ہوگیا، نوکر ہوں، سیٹھ صاحب ہوں، میں ہوں، کوئی بھی ہو اسے ہنسانے کے کام میں یہ حیرت سے دیکھتی تھی، سیٹھ صاحب کے افسردہ چہرہ پر بھی تبسم کی رونق اگر کوئی پیدا کرسکتا تھا تو وہ جمشید تھا،

یہ تو ہوسکتا ہے، ایک آدمی ہمارے ساتھ رہتا ہو، لیکن ہم اس سے خلا ملا نہ رکھتے ہوں، اور ہمارا یہ رنگ دیکھ کر وہ بھی گھلنے ملنے کی کوشش نہ کرے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک آدمی روتوں کو ہنسا دیتا ہو، دلچسپ اور مذاق سنج ہو، اور ہم اسے نظر انداز کردیں،

سیٹھ صاحب کی افسردہ دنیا میں میں نے مسرت کبھی تلاش ہی نہیں کی، میں نے سمجھ لیا تھا، خوشی دوسروں کا حصہ ہے، اور افسردگی میرا حصہ، لیکن جمشید میرے اس خیال کی دھجیاں اُڑانے پر تُلا ہوا تھا، وہ کہتا تھا، آپ چپ کیوں رہتی ہیں؟ ہنسیئے خوب ہنسیئے میں جواب دیتی، تو اپنے مطب میں مریضوں کا علاج اسی عمل

کرتے ہو؟ کوئی مریض آیا، تم نے اسے گدگدانا شروع کردیا اور وہ چنگا ہوگیا"

وہ اور زور سے ہنسا، اس نے کہا "گدگدی کی کیا ضرورت ہے؟ کیا باتوں سے گدگدی کا کام نہیں لیا جاسکتا؟ دیکھئے نا سیٹھ صاحب کو بغیر گدگدائے میں کتنا ہنسا لیتا ہوں، آپ بھی کتنی چپ چپ رہتی تھیں لیکن اب جب دیکھو جب آپ ہنسا کرتی ہیں یا نہیں؟"

میں نے کہا:

ہاں بھئی بات تو یہی ہے، سیٹھ صاحب کو تم ہنسا لیتے ہو کمال کرتے ہو؟"

آپ نے میرے اس طریق علاج کا کمال ابھی دیکھا نہیں ہے ارے صاحب اس سے بوڑھے جوان ہوجاتے ہیں، اگر میں آپ کے سیٹھ صاحب کو گلفام نہ بنادوں تو میرا ذمہ!"

یہ کہہ کر پھر اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا،

میں نے کہا:

" تمھیں کوئی ایسا طریق علاج بھی معلوم ہے جو جوانوں کو بوڑھا بنادے؟"

وہ دفعتہً سنجیدہ ہوگیا، اُس نے پوچھا:

کیا کہا آپ نے؟ جوانوں کو بوڑھا بنانے والا نسخہ؟"

میں نے کہا:-

باب ۱۵
لگاوٹ

فرصت کے اوقات جمشید میرے پاس گزارتا تھا، وہ دیوانہ وار ہنسنے کا عادی تھا، بعض دفعہ تو اس کی ہنسی بری لگنے لگتی تھی چاہے کوئی بات ہنسی کی ہو یا نہ ہو، اسے ہنسی سے مطلب؛

ایک روز وہ میرے پاس آیا، میں اخبار پڑھ رہی تھی

اس نے کہا:

"کوئی بڑی دلچسپ خبر ہے کیا؟"

میں نے آنکھ اُٹھا کر اسے دیکھا، پھر اپنے پڑھنے کا سلسلہ جاری کر دیا، اس نے پھر کہا:

"اغوا کی کوئی خبر ہوگی؟" یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

میں نے اخبار پر نظر جمائے جمائے کہا:

توبہ تم تو ہر وقت ہنسا کرتے ہو، یہ بھی کوئی ہنسی کی بات ہے، اچھا میں اغوا کی خبر پڑھ رہی تھی، پھر تم ہنسے کیوں اور وہ بھی اتنے زور سے

"ہاں ہاں، کہہ تو رہی ہوں"

اس نے حیرت کے ساتھ آنکھیں پھاڑ کر کہا:

اس نسخہ کی کیا ضرورت ہے؟ کس کے لئے چاہئے ذرا بتائیے تو؟"

میں نے ہنس کر کہا:

مجھے اپنے لئے چاہئے کر دو گے کیا تم؟ آئے ہیں بڑے ڈاکٹر بن کر اور اتنا سا نسخہ بھی نہیں معلوم!"

اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی، چہرہ سنجیدہ ہو گیا، اس نے کہا:

"عجیب! ایسے لوگ تو مجھے بہت ملے، جو اپنے بڑھاپے میں جوانی کا رنگ بھرنا چاہتے تھے، لیکن ایسا آدمی کوئی نہیں ملا تھا جو جوانی کو بڑھاپے سے بدلنا چاہتا ہو، صرف آپ ایک ملی ہیں ایسی! لیکن آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟ کیا اس لئے کہ سیٹھ صاحب بوڑھے ہیں، میں کہہ تو رہا ہوں انھیں جوان بنا دوں گا میں"

میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا:

"تم سیٹھ صاحب کو جوان نہیں، اپنا سا نوجوان بنا دو وہ جانیں ان کا کام، میں تو اپنے لئے کہہ رہی ہوں، میرے مرض کا کچھ علاج ہے تمہارے پاس؟ اگر نہیں ہے، تو شرماتے کیوں ہو؟ کہہ دو صاف صاف ہر ڈاکٹر ہر مرض کا علاج نہیں کر سکتا، اتنا تو میں بھی جانتی ہوں"

وہ خاموش ہو گیا، اور میں جانے کیا سوچنے لگی،

کہ میرا دماغ ہل گیا؟"

وہ کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا، کہنے لگا:۔

"میں بھی اغوا کی خبریں بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں، جب اخبار اٹھاؤں گا پہلے یہی خبریں تلاش کروں گا، پھر ایک سرسری نظر جنگی خبروں پر ڈال لوں گا!"

مجھے بھی ہنسی آگئی، میں نے کہا:۔

آخر اغوا کی خبروں میں کیا ایسی دلچسپی ہوتی ہے، کہ تم جنگی خبریں بھی نہیں پڑھتے، اور پہلے انہی کو ڈھونڈھنے لگتے ہو، کیوں جی؟"

وہ پھر ہنسا اور کہنے لگا:۔

"بات یہ ہے کہ جوانی کا آرٹ کچھ اغوا کے واقعات ہی ابھرتا ہے، خالی عشق و محبت کا سوانگ اس آرٹ سے کورا ہوتا ہے!"

پھر اس نے اپنا منہ بالکل میرے منہ کے قریب کر لیا، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، "سمجھ گئیں آپ؟"

کمبخت میں جانے کیا بات تھی، بھونڈی سے بھونڈی بات اس مزے میں کہتا، کہ خواہ مخواہ دلچسپی ہو جاتی تھی، میں نے کہا،

"وہ کیسے؟"

یکایک وہ سنجیدہ بن گیا، کہنے لگا:

"ان چیزوں کا تعلق تجربہ سے ہے اگر آپ تجربہ کرنا چاہیں، تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں!"

"یعنی!"

"میں آپ کا اغوا کر سکتا ہوں!"

مجھے غصہ آگیا، میں نے بپھرے ہوئے تیوروں کے ساتھ کہا:

"کیا مطلب؟"

"بھاگ چلئے میرے ساتھ!"

"پھر وہی بکے جا رہے ہو تم؟"

اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟

"خفا ہونے کی بات نہیں ہے؟" میں تمہارے ساتھ بھاگ چلوں کیوں؟ اپنے شوہر کو گھر بار کو چھوڑ دوں؟"

وہ پھر مسکرایا، اس نے کہا:۔

جتنی عورتیں اور لڑکیاں دوسروں کے ساتھ بھاگتی ہیں یعنی اغوا ہوتی ہیں انھیں لامحالہ اپنے شوہروں کو اور گھر بار کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے، یا تو گھر بار سے ہی دلچسپی لے لیں، اور شوہروں کے قدموں سے لپٹی رہیں، یا پھر اغوا کے مزے لوٹ لیں، دونوں باتیں ایک ساتھ تو نہیں ہو سکتیں؟"

"میں سوچنے لگی، عجیب منچلا آدمی ہے، میں نے کچھ ہنسی اور کچھ غصہ کے ساتھ کہا:۔

"تمہارے نزدیک اغوا بڑی مزے دار چیز ہے کیوں؟"

"یقیناً!"

"آخر کس طرح ؟"

"پھر میں کچھ کہوں گا ، تو آپ خفا ہو جائیں گی ؟"

"نہیں خفا نہیں ہوں گی کہو ۔"

"مزیدار کس طرح ہے ۔ اس کا صحیح اندازہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ کسی کا اغوا کر لیں ، یا آپ کو کوئی اغوا کر لے جائے باقی یہ موٹی بات تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے ، کہ محبت آسودگی میں اچھی طرح پھل پھول نہیں پاتی ، اس کی آبیاری تو کچھ خطرات ہی میں ہوتی ہے !"

میں چُپ چاپ سُن رہی تھی ، اور وہ کہہ رہا تھا ۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیئے ، اغوا بڑی خطرناک واردات ہوتی ہے ، پھر بھی وہ کثرت کے ساتھ رونما ہوتی رہتی ہے ، آپ نے کبھی سوچا ایسا کیوں ہوتا ہے ؟"

اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ؟ کھلی ہوئی بات ہے ، عورت بھولی بھالی تو ہوتی ہی ہے ، اور مرد صاحب ایک ذاتِ شریف ہوتے ہیں ڈورے ڈالے ، سبز باغ دکھائے ، پرچا لیا غریب کو اور لے بھاگے کہیں ـــــ پھر کچھ روز بعد یا تو اُسے بے یار و مددگار چھوڑ کر کہیں رفو چکر ہو گئے ، یا اُونے پونے کسی کے ہاتھ اسے فروخت کر ڈالا !"

اس نے پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا ، کہنے لگا :

"واہ بھئی واہ ! خوب سمجھیں آپ ، میرا تو جی چاہتا ہے ، اپنا سر پھوڑ لوں ـــــ بالکل غلط سمجھیں آپ !"

ایک شوہر اپنی بیوی کو بغیر اغوا کا لطف لیے ہوئے بھی جب جی چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے ، ـــــ دور کیوں جائیے اپنی ہی مثال لیجئے ـــــ ایسے بھی شوہر اس دنیا میں موجود ہیں ، جو روز کئی کئی آدمیوں کے ہاتھ اپنی بیوی کو بیچتے ہیں ، اور اسی آمدنی سے گلچھرّے اُڑاتے ہیں ـــــ اب شادی کو بھی بُرا کہنے لگے آپ ؟"

"تو تمہارے نزدیک اغوا بڑی اچھی چیز ہے ؟"

"جی ہاں ! پُرلطف بھی ، اور رنگین بھی !"

اونہہ ہوگا ، نہ جانے کیسی باتیں کرتے ہو تم ، ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں بھئی !"

یہ کہہ کر میں اخبار پھر پڑھنے لگی ، اس نے اخبار میرے ہاتھ سے چھین لیا ، اس بے تکلفی پر مجھے غصہ تو بہت آیا ، میں کوئی سخت بات کہنے ہی والی تھی کہ میں نے سنا وہ کہہ رہا ہے :-

"جو خود اعتمادی ، اغوا میں ہوتی ہے آپ یقین کیجئے وہ شادی میں بھی نہیں ہوتی ۔"

"کر لیا یقین اب تو پنڈ چھوڑو"

"کر لیا یقین آپ نے ؟"

"ہاں ہاں اب تو خوش ہوئے ؟"

"جی بہت زیادہ !"

یہ کہہ کر وہی اخبار جو ابھی ابھی اس نے مجھ سے چھینا تھا پڑھنے لگا ۔

وہ بڑے غور سے اخبار پڑھ رہا تھا، اب میں نے اسے چھیڑا!

"کوئی خبر ملی؟"

اخبار دیکھتے دیکھتے اس نے کہا:

"کیسی خبر؟"

"وہی ڈھونڈھ رہا ہوں، ابھی تک تو ملی نہیں"

پھر اس نے زور سے اخبار میز پر پٹک دیا، کہنے لگے:۔

"سیٹھ صاحب تو جوان بن نہیں سکے، اب آپ بوڑھی بن جائیے"

"یا تو یہ دعویٰ تھا، کہ انھیں گلفام بنا دوں گا، یا چلے ہیں مجھے بوڑھا بنانے ——— تم سے یہ بھی نہیں ہو سکے گا

ہو بھی سکے، تو بھی یہ پاپ نہیں کر سکتا، میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا"

"کیوں؟"

جوانی وہ نعمت ہے، جو بار بار نہیں ملتی' ——— یقین نہ ہو تو پوچھ لیجئے سیٹھ صاحب سے!"

"وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی، تم سے کچھ نہ ہو سکے گا، باتیں جتنی چاہو تم سے کروا لو، کچھ کام تھوڑی کر سکتے ہو تم نکھٹو کہیں کے!"

وہ جھینپ سا گیا، اس نے تلملا کر کہا:

"آپ مجھے وہ کام کیوں نہیں لیتیں جو کام میں کر سکتا ہوں!"

"اوہو کوئی ایسا کام بھی ہے، جسے تم کر سکتے ہو ذرا بتانا تو وہ کام

مجھے بھی؟"

"میں آپ کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر سکتا ہوں، میں آپ کے دل کی سوکھی ہوئی کھیتی کو سرسبز و شاداب کر سکتا ہوں، میں آپ سے محبت کر سکتا ہوں، اور دنیا میں سب سے زیادہ آپ کو خوش رکھ سکتا ہوں!"

مجھے ہنسی آ گئی، میں نے کہا:۔

"واقعی میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، تم اتنے سارے کام کر سکتے ہو، یہ آج سے پہلے مجھے معلوم ہی نہ تھا، بڑے ہونہار ہو تم!"

ذرا کھسیا گیا، میں نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا:

ہاں ذرا یہ تو بتاؤ، ایک غیر عورت سے، ایک غیر مرد کی بیوی سے محبت کرنے میں کیا بہت لطف آتا ہے؟ ——— اغوا سے بھی زیادہ؟ دیکھو شرمانا نہیں، سچ سچ کہنا، نہیں تو ہم خفا ہو جائیں گے ہاں!

اب وہ سنبھلا، اس نے جھکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا:۔

"معاف کیجئے گا، مجھ سے غلطی ہوئی!"

مجھے اس پر ترس آ گیا، میں نے شفقت کے ساتھ کہا:۔

"میں نے معاف کیا، جوانی میں ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں دو چار، ہر آدمی سے ——— آدمی سے عورت سے نہیں سمجھے ——— لیکن اب ایسی غلطی نہ کرنا، ورنہ تمہیں سخت سزا ملے گی!"

وہ خاموش بیٹھا ہوا تھا، میں نے کہا:

"تم مجھے غلط سمجھے، میں وہ بے بس لڑکی نہیں ہوں، جس کے والدین

زبردستی کسی بوڑھے سے اس کا پلّو باندھ دیتے ہیں اور پھر وہ زندگی بھر یا تو روتی رہتی ہے اپنی قسمت کو، یا کوئی دوسرا مرد وا تاک لیتی ہے۔ میں وہ عورت ہوں جو روپے کے لالچ میں کسی بوڑھے کی ہو رہتی ہے، دونوں ہاتھوں سے اس کی دولت لوٹتی ہے، اور دونوں ہاتھوں سے اپنی جوانی لٹاتی ہے، اپنے بوڑھے شوہر سے نفرت کرتی ہے، اور گھر کے نوکروں، یا محلے کے لوگوں سے ساز باز شروع کر دیتی ہے، میں وہ عورت ہوں، جس نے سوچ سمجھ کر ایک بوڑھے سے شادی کی ہے، اور یہ شادی نہ لالچ کے ماتحت ہوئی ہے نہ والدین کے زور اور دباؤ سے یہ بالکل رضا کارانہ ہے، لہٰذا ایسی عورت نہ اغوا کی جا سکتی ہے، نہ ورغلائی جا سکتی ہے۔"

وہ بڑے غور و توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا، اس پر ندامت کی کیفیت طاری تھی، میں نے اپنی باتوں کا سلسلہ جاری رکھا:

"میں مانتی ہوں، جذبات کا دھارا کسی کے روکے نہیں رک سکتا اس میں بڑے بڑے بہہ جاتے ہیں، لیکن کمزور ہونے کے باوجود قدرت نے عورت کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ اسے روک سکتی ہے، پیچھے دھکیل سکتی ہے، میں عورت ہوں مجھ میں یہ طاقت ہے، اور میں اس دھارے کو پیچھے بہت پیچھے دھکیل بھی چکی ہوں!"

میں نے دیکھا، جمشید کی آنکھیں پُرنم تھیں!

باب ۱۶

جائزہ

کسی شریر اور ضدی بچے کو اس کی شرارت پر اگر ڈانٹ دیا جائے یا دو چار تھپیڑ لگا دئے جائیں، تو وہ رونے لگتا ہے، اور اپنی شرارت سے باز آ جاتا ہے، لیکن تھوڑی دیر بعد اس کی وہ انفعالی کیفیت دور ہو جاتی ہے، پچھلی سرزنش کو بھول جاتا ہے، اور پھر نئی اُمنگ کے ساتھ شرارتیں کرنے لگتا ہے،

جمشید کی یہی کیفیت تھی، اس روز جو میں نے اُسے جھڑکا تو وہ گھبرا گیا، اس پر ندامت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھیں پُرنم تھیں، لیکن یہ ساری انفعالی کیفیت رات بھر میں ختم ہوگئی صبح جو وہ مجھ سے ملا، پھر اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی، اور اس کی باتوں سے شوخی اور لگاوٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

آج وہ مطب سے جلد واپس آگیا، میں کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنی سہیلی فیروزہ کا خط پڑھ رہی تھی، اسے دیکھ کر میں نے کہا:۔

"اتنی جلدی آ گئے؟"

"جی نہیں لگا وہاں! چلا آیا!"

"تو یہ گھر کوئی کلب یا جوا خانہ ہے، کہ کام کرتے کرتے جی اُکتایا اور چلے آئے ڈاکٹر صاحب یہاں جی بہلانے کے لئے؟"

وہ مسکرانے لگا، اس نے کہا:۔

"کلب تو نہیں جوا خانہ ضرور ہے؟"

میں نے ترچھی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا:۔

"یہ کیسے؟"

"میں تو یہاں اپنی سب سے بڑی پونجی ہار چکا ہوں!"

"اوہو میں سمجھ گئی، آپ اپنا دل ہار بیٹھے ہیں یہاں ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک!"

"لیکن جوا تو دونوں طرف سے کھیلا جاتا ہے، کوئی ہارتا ہے کوئی جیتتا ہے، تم ہارے تو جیتا کون؟"

اس نے بڑی ڈھٹائی سے آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا:۔

"آپ!"

"میں سن سے ہوگئی، میں سمجھ رہی تھی، وہ یہی جواب دے گا، اس لئے کرید کرید پوچھ رہی تھی، لیکن جب اس نے یہی جواب دیا تو میرے دل کی حرکت تیز ہوگئی، گرم گرم خون کی ایک دھار معلوم ہوا میری کنپٹی سے اُتر کر دل کی طرف جا رہی ہے میں نے جی کڑا کر کے کہا:۔

"خبردار تم بہت بڑھنے لگے ہو، حد سے تجاوز نہ کرو"

اُس نے لاپرواہی کے ساتھ جواب دیا:

"آپ ہی نے تو پوچھا تھا، میں جھوٹ کیوں بولتا، کہدی میں نے سچی بات!"

"یہ اگر سچ بھی تھا، تو بھی تمہیں اس کا اظہار کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی!"

"آخر کیوں؟"

اس لئے کہ اَن ہونی بات نہیں ہوسکتی، میں سیٹھ صاحب کو چاہتی ہوں، عورت ایک وقت میں دو مردوں سے محبت نہیں کرسکتی یہ کمال تو قدرت نے مردوں ہی کو دیا ہے، کہ وہ بیک وقت بہت سی عورتوں سے محبت کرسکتے ہیں ——— تمہارا یہ بے حجابانہ اظہار عشق مجھے ڈگمگا نہیں سکتا!"

اس نے بڑی مسکینیت اور بھولے پن سے کہا:

"ارے آپ تو خفا ہوگئیں؟"

"کیوں نہ خفا ہوتی، کل تم اپنی غلطی کا اعتراف کر چکے ہو رو رو کر اس داغ کو دھو چکے ہو، اور آج پھر وہی غلطی کر رہے ہو، پھر اُس دھبے کو اُبھار رہے ہو، یہ خفا ہونے کی بات نہیں ہے؟"

یہ کہہ کر میں تیزی سے اُٹھی اور اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی، میں اپنی مسہری پر لیٹ گئی، اور اپنا جائزہ لینے لگی، میں نے

محسوس، میرا دل میری زبان کا ساتھ نہیں دے رہا ہے، زبان سے میں جمشید کو جھڑکتی ہوں، لیکن میرا دل اس کی طرف کھنچ رہا ہے، میں نے اس کے سامنے اقرار کیا تھا کہ میں سیٹھ صاحب سے محبت کرتی ہوں، لیکن میں نے جھوٹ کہا تھا، میرا دل کہہ رہا تھا کہ تو جھوٹی ہے، تجھے سیٹھ صاحب سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہے، نفرت ہے، میں داعیہ رکھتی تھی کہ مجھے اپنے جذبات پر قابو ہے، لیکن آج میرا یہ داعیہ ٹوٹ رہا تھا، جیسے کسی ننھے نادان بچے کو ایک منہ زور گھوڑے پر بٹھا کر اسے ایک زور کی چابک لگا دی جائے، وہ سرپٹ بھاگنے لگے، اور وہ بچہ اسے روکنے کی کوشش کرے اور روک نہ سکے، یہی میری کیفیت تھی، میں ایک کمزور بچہ کی طرح جذبات کے رہوار تیز گام پر بیٹھی ہوئی ہچکولے کھا رہی تھی،

نے ہاتھ باگ پر تھا نہ پا تھے رکاب میں

میرا جی چاہ رہا تھا، اُٹھوں اور جمشید کے سامنے جا کر سر جھکا دوں اور اقرار کروں کہ میں تجھ سے محبت کرنے لگی ہوں، تو ہار انہیں جیتا ہے محبت کے جوئے خانہ میں تو نے پانسہ پھینکا اور مجھے جیت لیا،

لیکن معاً میری آنکھوں کے سامنے سیٹھ صاحب کی تصویر گھومنے لگی، اور ان کے احسانات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے اپنے عزم اور استقامت کا وہ فخر بھی مجھے یاد آ گیا، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا، میں دل ہی دل میں اپنے تئیں ملامت کرنے لگی، میں نے

سوچا، میں انسان سے حیوان کیوں بنتی جا رہی ہوں؟ میں تو ان لوگوں کا مذاق اُڑایا کرتی تھی، جو جذبات کی رَو میں بہتے ہیں، جو جوانی کو قابو میں نہیں رکھ سکتے ——، میں تو محبت کو جنسی بیماری سمجھا کرتی تھی پھر مجھے یہ کیا ہو گیا ہے؟ میں خود کیوں اس بیماری میں مبتلا ہوئی جا رہی ہوں، میں خود کیوں تنکے کی طرح جذبات کے دھارے میں بہی جا رہی ہوں، میں خود کیوں انسانیت کا جامہ اُتار کر حیوانیت کا لباس عریاں پہننے پر تلی ہوئی ہوں، اس سے بڑھ کر شرم کی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ ایک عورت جنسی کشش کے آگے سر جھکا دے، کیا دُنیا میں صرف یہی ایک لطف ہے، کہ جوانی جوانی سے گتھ جائے، اس کے علاوہ دنیا کی ہر چیز بے کیف اور بے رنگ ہے، میں نے اُسے کبھی نہیں مانا تھا، اب بھی نہیں مانوں گی، میں خدمت کے لئے جیوں گی، خدمت کرتے کرتے مروں گی، اپنی کم نصیب بہنوں کی بھی، اور اپنے بوڑھے شوہر کی بھی، شوہر کے خیال کے ساتھ ہی مجھے مختار کا خیال بھی ستانے لگا، پھر مجھے شوہر سے نفرت سی ہونے لگی، لیکن اب میں اپنے قابو میں آ چکی تھی میں نے مختار کا خیال دل سے نکال دیا، اور سیٹھ صاحب کی تصویر خیالی پر عظمت و تقدیس کے پھول نچھاور کر کے میں پھر اُن کی پوجا کرنے لگی،

بڑی دیر تک میں کشمکش خیال میں گرفتار رہی، کبھی نفس بہکاتا تھا اور میں اس کی ہو رہتی تھی، کبھی عقل سامنے آتی تھی، اور میں اس کی

باب ۱۷
نوک جھونک

دوسرے روز میں شیریں کے ہاں گیا، تو وہ سراپا اشتیاق بنی میرا انتظار کر رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی مسکراتی ہوئی لپک کر اٹھی "آئے بہت انتظار کراتے ہیں آپ" کہتی میرے قریب آکر بیٹھ گئی،

میں نے کہا:

"رہنے دو یہ لگاوٹ کی باتیں، کھل گئی تمھاری قلعی"

"ارے کیوں کیا ہوا؟"

"چاہتی جمشید کو ہو، اور پینگ مجھ سے بڑھا رہی ہو؟"

وہ بڑے زور سے ہنسی، اس نے کہا:

"اوہو! رشک آرہا ہے آپ کو جمشید پر؟ جلنے لگے آپ اس غریب سے؟ تمھیں جلانے کے سوا آتا کیا ہے؟ اب تم مکر نہیں سکتیں، خود کہہ چکی ہو کہ جمشید کی طرف تمھارا دل کھنچ رہا تھا، اور تم اس سے محبت کرنے لگی تھیں، غلط ہے یہ؟"

پیروی کرنے لگی تھی، بہت دیر کے بعد میں چونکی، جیسے بھیانک خواب دیکھ کر کوئی چونک پڑے، اب میں اپنے آپ میں آچکی تھی، اور پہلے کی طرح پھر اپنے فیصلہ اور اپنے خیال پر اٹل تھی، اب مجھے کوئی نہیں بہکا سکتا تھا، اب میرے دل میں کسی کا خیال نہیں تھا، سوا نوجوان بیواؤں کے لئے ایک تربیتی ادارہ قائم کرنے کے، یا اپنے شوہر کی بے لوث خدمت کرنے کے اضطراب دور ہو چکا تھا، اور سکون و اطمینان اور آسودگی کی طاقت پھر میرے دل میں آچکی تھی، اب میرا دل ہنس رہا تھا، اور ہونٹ بھی مسکرا رہے تھے اب میرے لئے جمشید میں کوئی کشش نہ تھی، نہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں، نہ اس کے مضبوط دست و بازو میں!

میں کہہ رہی تھی، جب جمشید مطب سے آیا، تو میں فیروزہ کا خط پڑھ رہی تھی، بڑی محبت تھی ہم دونوں میں۔ انٹرنس تک ہماری تعلیم ساتھ ساتھ ہوئی تھی، پھر مجھے سیٹھ صاحب اُچک لے گئے۔ اس کے والد انجینئر تھے اُن کا لاہور تبادلہ ہوگیا، فیروزہ بھی وہاں چلی گئی، اور وہاں برابر پڑھتی رہی، اس سال اس نے بی۔ اے کا امتحان دیا تھا، اور تعطیل کا زمانہ میرے پاس گزارنے کے لئے آرہی تھی، میں نے اُسے خط لکھا: تو فوراً آ، ریل پر نہیں ہوائی جہاز پر، تیرے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں، بے مروت کہیں کی۔

"بالکل غلط!"

"تمہارے کہنے سے میں مان لوں؟"

"میرے سے آپ میری اور باتیں مان رہے ہیں، تو یہ بات کیوں نہیں مانیں گے؟"

یہ کہہ کر وہ اور زیادہ قریب آگئی، اس نے کہا:

"آپ نے پوری کہانی سنی نہیں، اور حسد کی آگ میں جل جل کے کباب ہونے لگے، سچ کہتی ہوں اگر آپ عورت ہوتے تو جلتے جلتے دق ہوگئی ہوتی آپ کو!"

یہ کہہ کر پھر وہ ہنسی، میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ بولی:-

"پہلے پوری کہانی سن لیجئے، پھر اعتراض کیجئے گا، میں نے طے کر لیا ہے آپ سے اپنے دل کی ایک ایک بات کہوں گی، کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی، میں آپ کو اپنے دل کے ایک ایک خیال، اور ہر ہر لغزش سے آگاہ کر رہی ہوں، ہر وہ کیفیت جو مجھ پر گذری ضرور آپ سے کہوں گی ——— جمشید پر میرا دل ضرور مائل ہوا تھا، یہ کیفیت کچھ روز اور رہتی تو میں بیشک اس سے محبت کرنے لگتی، لیکن میں سنبھل گئی، جیسے کوئی آدمی شراب خانہ کے دروازہ تک پہنچ کر لوٹ آئے، محبت تو میں نے آپ سے کی ہے اور زندگی بھر کرتی رہوں گی، آپ پہلے میری ساری کتھا سن لیجئے، اس کے بعد اگر آپ کو مجھ سے ہمدردی ہو، تو میری محبت کا جواب محبت سے دیجئے گا ورنہ ٹھکرا دیجئے گا، مجھے!"

میں نے دیکھا پھر اس کی آنکھیں لبالب جام شراب کی طرح آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں، میں نرم پڑ گیا، میں نے کہا۔

"اچھا اچھا کہانی سناؤ؟ ——— تم تو ضرورت سے زیادہ حساس ہو، ذرا کوئی بات بُری لگی، اور تمہارا شیشۂ دل چور چور ہوا۔"

وہ سچ مچ رونے لگی، اس نے کہا:

"میرا دل دکھا ہوا ہے، ٹوٹا ہوا ہے، ذرا سی ٹھیس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، میری کیا خطا ہے اس میں۔"

وہ بڑی دیر تک روٹھی رہی اور میں اسے مناتا رہا جس انہماک سے روٹھتی تھی، اسی جوش سے وہ خوش بھی ہو جاتی تھی، جب خوش ہوتی، تو پھر وہی ادائیں اس میں سرایت کر جاتی تھیں، جو اس کی خصوصیت تھیں،

پھر اس نے اپنی کہانی کا سلسلہ شروع کیا:

فیروزہ آئی، اور اس کے آتے ہی میری زندگی کے چمن میں بہار آگئی، سیٹھ صاحب کی بے اعتنائی، بختاور کے عروج، جمشید کی آمد اور اظہار عشق نے مجھے بہت گھائل کر دیا تھا، میرا دل بجھا بجھا سا رہتا تھا فیروزہ کو میں نے اسی لئے بلایا تھا کہ وہ آئے گی، تو میری زندگی پھر ہنسی اور خوشی کا مجموعہ بن جائے گی، وہ بڑی چنچل تھی، بوٹی بوٹی اس کی تھرکتی تھی مجھے یقین تھا کہ اس کے آتے ہی ہمارے گھر کی فضا بالکل بدل جائے گی، اور میرا روتا ہوا دل پھر ہنسنے لگے گا،

ایسا ہوا، وہ ایک اجڑے ہوئے چمن میں نسیم بہار بن کر آئی، اور اس

کے آتے ہی مرجھائے ہوئے پودوں میں نئی زندگی پیدا ہوگئی، کلیاں پھول بن گئیں، اور پھول پھر سے رونق چمن بن گئے،

وہ یہ سمجھکر آئی تھی کہ میں سیٹھ صاحب سے بہت ناخوش ہوں، اور ناکام زندگی کا دکھ جھیل رہی ہوں، لیکن اسے دیکھتے ہی میں نے اس خوشی کا اظہار کیا، کہ اس کا خیال بدل گیا، ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگی:

"بڑی چالاک ہے تو شیریں!"

میں نے کہا:

"یہ کیسے جان لیا تم نے؟"

"ارے ہم تو اڑتی چڑیا پہچانتے ہیں، تو تو پنجرے میں بند ہے تجھے بھی نہ پہچانیں گے؟"

"کیا پہچانا، ذرا بتاؤ تو!"

کہنے لگی:-

خوب رجھایا ہے بڈھے کھوسٹ کو، اب تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں تیری؟"

میں بڑے زور سے ہنسی، میں نے کہا:

"خوب سمجھیں، اچھا ٹھہر تو جا، دیکھ تیرے لئے میں سیٹھ صاحب سے بھی زیادہ مالدار، اور ان سے بھی کہیں زیادہ بوڑھا تلاش کرتی ہوں، پھر رجھاتی رہنا اسے جی بھر کے"

یہ سن کر وہ جل ہی تو گئی، تیوری چڑھا کر بولی:-

"لے ہے ذرا ڈھونڈھ تو، میں بھی وہ مزا چکھاؤں بچا کہ یاد ہی کریں عمر بھر، میں شیریں بنا شد، سن لو کان کھول کے!"

میں نے کہا:

ابھی سے جب یہ حال ہے، پھر تیری اس بوڑھے سے جب شادی ہو جائے گی، تو واقعی تو ہر وقت تلوار ہاتھ میں لئے بیٹھی رہا کرے گی ——— ؟ اچھا آنے دے اسے میں ایک ایک بات تیری کہدوں گی، اور منع کردوں گی کہ تجھ سے شادی کا خیال بھی اپنے دل میں وہ نہ لائے"

وہ منہ چڑا کر بولی:

"کون ہے وہ جس کا انتظار ہو رہا ہے؟"

"انتظار تیرے لئے ہو رہا ہے، وہی ہے تیرا ہونے والا بوڑھا شوہر ——— !

"کون ذرا نام تو بتاؤ؟ اس خرانٹ کا؟"

"وہی جمشید اور کون!"

یہ سن کر وہ زرد ہوگئی، میں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا جب سے وہ آئی تھی جمشید کو للچائی للچائی نظروں سے دیکھتی رہتی تھی،

میں نے کہا:-

"چپ کیوں ہوگئیں؟ بولو!"

اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:-

"تم تو پاگل ہو"

"پاگل نہیں چالاک، چالاک نہ ہوتی، تو سیٹھ صاحب کا ایسا جوان کیوں تاکتی؟ اور ہاں تھوڑی سی پاگل بھی ہوں، ورنہ جمشید جیسا بوڑھا کھوسٹ تیرے لئے کیوں تجویز کرتی؟"

فیروزہ سٹ پٹا گئی، کوئی جواب اس سے بن نہیں آیا، اور وہ روہانسی ہوگئی، میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کے گالوں پر اپنے ہاتھ پھیرنے لگی، بڑے پیار کے لہجے میں میں نے کہا:۔

"ہائے محبت کی بے بسی! میرے چہکتے ہوئے بلبل کی بھی زبان بند ہوگئی، کچھ تو بول میری فیروزہ لاڈلی!"

اسے کچھ لطف سا آرہا تھا، میری گود میں اس نے اپنا سر رکھے رکھے بڑی محمور نگاہوں سے مجھے دیکھا، اور کہنے لگی:۔

"تم بڑی شریر ہو شیریں!"

میں نے ایک چٹکی لی، وہ کسمسا گئی کہنے لگی:۔

"یہ کیا؟"

"شرارت"۔ میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگی، مجھے بھی ہنسی آگئی۔

اتنے میں سیٹھ صاحب آگئے، ان کی تشریف آوری کے بعد میں سنجیدہ ہوکر بیٹھ گئی، اور فیروزہ بھی!

★

باب ۱۸
اقرار محبت

وہی گھر تھا، جس میں ہر وقت میں اُداس اور مضمحل بیٹھی رہتی تھی کبھی سیٹھ صاحب کی بے اعتنائی، اور ان کی عادت قبیحہ پر خون کے آنسو رویا کرتی، کبھی نجتاور کی سرمستیاں دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتی، کبھی اپنی بے کیف اور بے رنگ زندگی مجھے جنجال نظر آتی تھی، غرض ایک عجیب یاس اور افسردگی کا عالم تھا، جو مجھ پر طاری تھا، میں ہنسا بھی چاہتی تھی تو مجھے رونا آتا تھا، لیکن فیروزہ کے آتے ہی رُت بدل گئی، اب وہی گھر تھا، لیکن پہل پہل سے اس میں رونق آگئی تھی، سچ تو ہے کہ فیروزہ نے میرے لئے وہ کام کیا، جو اچھے سے اچھے ڈاکٹر اور حکیم کی دوا بھی نہیں کرسکتی تھی، اس کے آتے ہی میں اپنی تمام کلفتیں بھول گئی، وہ ہر وقت مجھے ہنسایا کرتی اور میں ہنسا کرتی، میں بالکل بھول گئی تھی سیٹھ صاحب کو، اور اُن کے چہیتے نجتاور کو،

شہر میں وسیع پیمانہ پر ایک نمائش ہوئی، سارا شہر اُمنڈا پڑا تھا اس کی سیر کے لئے۔

ایک روز فیروزہ کو لے کر میں بھی وہاں گئی، بڑی دیر تک ہم لوگ ادھر اُدھر کی سیر کرتے رہے، فیروزہ سے یہاں بھی چلا نہ بیٹھا گیا کہنے لگی:۔

"بھئی چلتے چلتے تھک گئے ہم تو"

"تو کہیں بیٹھ کر دم لے لو، تھوڑی دیر ——— لیکن بیٹھو گی کہاں؟"

"وہ سامنے سبزہ ہے، چلو وہیں بیٹھیں بنچوں پر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں"!

بچوں کی طرح مچل کر کہنے لگی:

"ہم تو بنچ پر بیٹھیں گے"

"واہ ری پگلی خالی بھی ہے کوئی بنچ؟"

"ابھی ہوئی جاتی ہے"

یہ کہہ کر وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھی، تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے چند بنچیں پڑی تھیں، ان پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بنچ کے سامنے وہ جا کر رُکی، ایک سن رسیدہ بوڑھا بیٹھا ہوا، کچھ سوچ رہا تھا، ایک اور آدمی اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، وہ اتنا بوڑھا تو نہیں تھا لیکن عمر اس کی بھی ۵۰ سال کے لگ بھگ ہوگی، دونوں نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور آنکھیں نیچی کرلیں۔

فیروزہ نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا:

"تھوڑی سی جگہ ہمیں بھی دے دیجئے آپ ادھر ہٹ جائیے ذرا اور دوسرے سے مخاطب ہوکر، آپ ذرا اُدھر کو سرک جائیے، بیچ میں میں بیٹھ جاؤں گی، بہت تھک گئی ہوں چلتے چلتے"

اس بے تکلفی پر دونوں جز بز ہوئے، جو زیادہ بوڑھا تھا، وہ اُٹھ گیا جو کم بوڑھا تھا وہ بیٹھا رہا، فیروزہ نے جھٹ اس کی جگہ پر قبضہ کیا پھر وہ کھسک کر بالکل اس آدمی سے مل کر بیٹھ گئی، جو بیٹھا رہ گیا تھا، اس نے مجھ سے کہا:

آؤ تم بھی بیٹھ جاؤ، ہم تینوں سہیلیوں میں باتیں ہوں گی، مزے مزے کی!"

مجھے ہنسی آگئی، کہ ذرا دیکھو تو اس شریر کو، مردوے کو بھی اپنی سہیلی بنائے لے رہی ہے، اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بنچ پر بٹھا لیا یہ رنگ دیکھ کر وہ حضرت بھی کھسک گئے جیسے ہی وہ اُٹھا فیروزہ نے:

خس کم جہاں پاک

کہہ کر ایک زور کا قہقہہ لگایا، بیچارہ منہ لٹکائے چلا گیا، میں نے اس کے ایک چٹکی لی،

کمبخت اتنی چنچل تو نہ بن، یہ بوڑھے تھے، طرح دے گئے، کوئی جوان ہوتا تو ساری شیخی کرکری ہو جاتی تیری، ایسا جواب دیتا تجھے!"

"اے چلو، جوان ہو یا بوڑھا، میں تو سب کو چٹکیوں میں اُڑاتی ہوں"

بڑی دیر ہم لوگ باتیں کرتے رہے، شام ہوتے گھر واپس آئے کھانا وانا کھا چکے تو کہنے لگی:۔

"ہم تو سینما جائیں گے"

"نا بابا میں نہیں جاتی، میرے سر میں ہو رہا ہے درد، تمہیں جانا ہے تو جاؤ!"

"اے واہ تو میں اکیلی جاؤں؟"

"اکیلی چلی جاؤ گی تو کیا تمہیں کوئی بھگا لے جائے گا، یا تو مردوں کو چکیوں میں اڑاتی ہو، یا نئی نویلی دلہن کی طرح سہمی جا رہی ہو چلو ہٹو بھی"

"میں جاؤں گی اور تمہیں بھی میرے ہمراہ جانا پڑے گا"

"اچھا تو جمشید کے ساتھ چلی جاؤ، میرا تو سر پھٹا جا رہا ہے، مارے درد کے!"

جمشید کا نام سن کر فیروزہ ذرا چکرا گئی، نہ ہاں کہتے بنتا تھا نہ نہیں کہہ سکتی تھی، جمشید بھی بیٹھا ہوا تھا، وہ بھی گھبرا سا گیا، میں نے جمشید سے کہا:

"بڑے اکل کھرے ہو تم، فیروزہ ہماری مہمان ہے، تم سے اس کی یہ خاطر بھی نہیں ہو سکتی کہ ذرا سینما دکھا لاؤ۔

"تو میں کب انکار کرتا ہوں چلئے"

"میں نہیں جا سکتی، تم لے جاؤ اسے اپنے ساتھ میرے سر میں درد ہو رہا ہے، کے دفعہ کہوں؟"

جمشید چپ ہو گیا، فیروزہ بھی چپ بیٹھی ہوئی تھی، میں نے ملازم سے کہا، ڈرائیور سے کہو کار تیار کرے، جمشید اور فیروزہ سینما دیکھنے

جائیں گے، ملازم چلا گیا، اور یہ دونوں میرا منہ دیکھنے لگے، میں نے فیروزہ سے کہا:

"گم سم کیوں بیٹھی ہو، اب جاؤ نہ سینما، اٹھو تیاری کرو"

اس نے گردن نیچی کر کے جواب دیا:

تم بھی چلو ـــــ نہیں تو میں بھی نہیں جاتی"

میں نے جمشید سے کہا:

"تم بڑے نالائق ہو، کیا تم نے فیروزہ کو کچھ چھیڑا تھا؟"

اس نے حیران ہو کر کہا:-

"بالکل نہیں، یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟"

"پھر وہ تمہارے ساتھ جاتے ہوئے کیوں جھجک رہی ہے؟"

فیروزہ تلملا گئی بولی:-

"شیریں! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"جھوٹ ہے یہ؟"

"بالکل جھوٹ"

"تو تم جمشید کے ساتھ سینما دیکھنے کیوں نہیں جاتیں؟"

"نہیں جاتے ہماری مرضی"

اتنے میں ملازم نے اطلاع دی، "کار دروازہ پر کھڑی ہے"

میں نے کہا۔

اب جلدی کرو وقت کم ہے۔ تماشہ شروع ہونے کے بعد پہنچیں، تو

لطف آدھا رہ جائے گا، ارے جمشید بُت کی طرح بیٹھے ہو، کپڑے پہنو
فیروزہ کی تو عادت ہے نخرے کرنے کی، یہ جاتے جاتے بھی انکار کرے
جائیگی میں خوب پہچانتی ہوں اس کی عادتوں کو،

جمشید اٹھا اور کپڑے بدل کر آگیا، میں نے فیروزہ کے ایک
نمودار چٹکی لی، وہ کلبلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی، میں نے کہا:
سیدھی سی جاتی ہو تو جاؤ ورنہ میں جمشید سے کہوں گی اور وہ گھسیٹتے
ہوئے لے جائیں گے تمھیں، سُنا تم نے؟"

فیروزہ کو بھی تیار ہونا پڑا، میں دونوں کو دروازہ تک پہنچا آئی دونوں
پاس پاس بیٹھے تھے، جمشید کچھ گھبرایا گھبرایا سا، اور فیروزہ کچھ سہمی سہمی سی
لیکن جمشید کے چہرے پر مجبوری کا نشان جھلک رہا تھا، اور فیروزہ کے
چہرے پر خوشی کی لہریں اُٹھ رہی تھیں، دونوں اس حقیقت سے بے خبر تھے
کہ ان کی دلی کیفیت ان کے چہروں پر نمودار ہو چکی ہے، اور کسی نے
بھانپ بھی لیا ہے،

رات کو ایک بجے سپنا دیکھ کر فیروزہ سیدھی میرے کمرے میں آئی،
میں سو رہی تھی، اس نے مجھے جھنجھوڑ کر سوتے سے اٹھایا:

"اری سُن تو!"

"کیا سُنا رہی ہے رات کے دو بجے یہ سونے کا وقت ہے یا باتیں کرنے
کا؟ پگلی کہیں کی ـــــ ہمیں سونے دے!"

"تجھے سننا پڑے گا!"

میں ایک جمائی لے کر اُٹھ بیٹھی، جانتی تھی اس سے پنڈ چھڑانا آسان
نہیں ہے، وہ کہنے لگی:

"بڑا اچھا تماشہ تھا، سچ!"

"ہاں ہوگا اچھا تو؟"

"تم کیوں نہ چلیں ہمارے ساتھ!"

"میں چلتی تو تھیں جمشید سے اکیلے ملنے کا موقع کیسے ملتا؟ تم اس سے
باتیں کیسے کرتیں، تم اسے جی بھر کے دیکھتیں کیسے؟ میں کوئی پاگل ہوں، کہ
اپنی فیروزہ کے رنگ میں بھنگ کر دیتی وہاں جاکر؟"

اس شوخی کا فور ہوگئی، وہ بے بسی کے ساتھ کہنے لگی:

"پھر وہی باتیں؟"

"ہاں پھر وہی باتیں کچھ غلط ہیں یہ؟"

"نہ جانے تم کیا سمجھ رہی ہو؟"

"وہی سمجھ رہی ہوں جو تیرے دل میں ہے، اور میری زبان پر ہے؟"

"ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں"

میں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، اور کہا:-

"فیروزہ! دنیا میں ایک تو ہے جو میری سچی سہیلی ہے، تجھ سے میں
اپنی کوئی بات نہیں چھپاتی، لیکن تو مجھے غیر سمجھتی ہے، اپنے دل کی بات
چھپاتی ہے، تو جمشید کو چاہتی ہے، لیکن مجھے نہیں بتاتی، جیسے میں اسے
چھین لوں گی تجھ سے ـــــ اری پگلی، میں تو اُس ہیرے کو

تیرے پتے باندھنا چاہتی ہوں ——"

فیروزہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، وہ بھی میرے گلے سے لپٹ گئی، اس نے زور سے مجھے بھینچا، میرے کاندھے پر اپنی گردن رکھے رکھے اس نے کہا:-

"کتنی اچھی ہو تم"

میں نے اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کے بل پر اوپر اٹھایا، اور ایک ہلکی سی چپت اس کے گالوں پر لگاتے ہوئے کہا:

"میں یا جمشید"

"جمشید بھی، لیکن تم ان سے بھی زیادہ!"

یہ کہہ کر پھر اپنی باہیں اس نے میری گردن میں حمائل کیں، اور اپنی گردن میرے کاندھوں پر ڈال دی۔

میں نے اس سے کہا۔"بہت پسند ہے جمشید تمہیں؟"

اُس نے منہ سے کچھ نہیں کہا، خفیف سا تبسم ہونٹوں پر پیدا کر کے اثبات میں اپنی گردن ہلائی، اور دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔

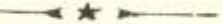

باب ۱۹
رفتہ رفتہ

جمشید کا خیال میں اپنے دل سے نکال دینا چاہتی تھی، خوش قسمتی سے فیروزہ آگئی میں نے دیکھا وہ محبت بھری نظروں سے جمشید کو دیکھتی ہے اس کی باتیں بڑے انہماک سے سنتی ہے، میں کبھی اس کا ذکر کرتی ہوں تو اس طرح جم کر بیٹھ جاتی ہے، کہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتی، مجھے موقع مل گیا میں نے کوشش کی کہ فیروزہ کے دل میں جمشید کی محبت رچ جائے، میں جانتی تھی جمشید جوان ہے، جوانی کے طوفان میں بہہ رہا ہے، وہ مجھ سے محبت اس لئے نہیں کرتا کہ اسے مجھ سے عشق ہے، اس لئے کرتا ہے کہ میں بھی جوان ہوں، اور جوانی جب جوانی کو لیتی ہے، تو اس طرح اس طرح اس کی طرف کھینچتی ہے، جس طرح سوئی مقناطیس کی جانب، اگر میں نے اس کی محبت کا جواب محبت سے نہ دیا، اور فیروزہ اس سے محبت کرنے لگی، تو وہ ضرور میرے خیال سے دست بردار ہو جائے گا، اور فیروزہ کی طرف اس طرح لپکے گا، جیسے بنگال کا کوئی کنگال کھانے کی

طرف بے تابانہ جوش کے ساتھ بڑھے،

میرا یہ خیال صحیح ثابت ہوا، فیروزہ سے میں نے اقرارِ محبت کرالیا اس نے اپنے دل کی بات مجھ سے بتادی، جمشید شروع شروع میں تو اس سے کھنچتا رہا، لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی اس سے دلچسپی لینے لگا، میں نے بھیا وہی جمشید جو فیروزہ سے دور دور بھاگتا تھا، اور اب پہروں اُس سے باتیں کیا کرتا ہے، گھنٹوں دونوں میں باتیں ہوتی رہتی ہیں، اور کوئی بھی نہیں اُکتاتا:

دونوں کا یہ رنگ دیکھ کر پہلے پہل میرے دل پر چوٹ سی لگی، جیسے کسی غریب کی پونجی کوئی ہتھیا لے، اور وہ منہ دیکھتا رہ جائے، میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے دل میں سیٹھ صاحب کے جذبہ خدمت کے سوا کوئی اور جذبہ پیدا ہو، میں اپنے دل کو عشق و محبت کے جذبات سے خالی رکھنا چاہتی تھی میں شباب کی چٹان پر سے اس طرح گزر جانا چاہتی تھی جیسے پرشور سمندر کی موج جو اپنی جوانی میں یہ بھی نہیں دیکھتی کہ کہاں چٹان ہے اور کدھر ساحل، میں جنسی کشش، جنسی خیال اور جنسی تقاضے کو جوان بلکہ نوجوان ہونے کے باوجود، اپنے قریب تک نہیں آنے دینا چاہتی تھی، یہی وجہ ہے کہ جمشید نے کمندیں پھینکیں، میرے اوپر مجھے گرفتار کرنا چاہا، مگر نہ کر سکا، لیکن جب میں نے دیکھا، جمشید اور فیروزہ اب گھل مل کر رہنے لگے ہیں، تو مجھے دھچکا سا لگا، شاید اس لئے کہ میں جمشید کو چاہنے کے باوجود، دل کے کسی گوشہ میں یہ خیال ضرور رکھتی تھی کہ کوئی

مجھے چاہے، سچ تو یہ ہے کہ عورت چاہے اور چاہے جانے کے لئے پیدا ہوئی ہے ——"

مجھ سے ضبط نہ ہوسکا، میں بول پڑا:

"یہی عورت کی کمزوری ہے!"

وہ بولی:

"یہ عورت کی کمزوری نہیں فطرت ہے" ——————

اچھا اب آپ سنتے ہیں داستان یا مباحثہ کریں گے؟ پھر میں بھی سنبھل کر بیٹھ جاؤں؟"

میں نے کہا:

"بابا تم سے کون بحث کرے؟ داستان سنائے جاؤ اپنی تم تو"

وہ کہنے لگی:

"وہی فیروزہ جو جمشید کا نام سن کر جھینپ جاتی تھی، اب جب دیکھو جمشید کا ذکر کر رہی ہے، اُسے مطب سے آنے میں دیر ہوئی اور وہ گھبرا گئی، شام کو وہ سیر و تفریح کے لئے گیا اور ۹ بجے کے بجائے دس بجے آیا، تو بڑی بی فیروزہ اٹوائی کھٹوائی لئے، اب میں اس کی ہمراز تھی اور وہ اپنے دل کی کسی کیفیت کو مجھ سے پوشیدہ نہیں رکھتی تھی،

ایک روز فیروزہ اپنے لئے کچھ چیزیں خریدنے بازار گئی ہوئی تھی، جمشید مطب سے واپس آیا، اور اپنے کمرہ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ یہ معمول تھا، کہ وہ مطب سے آیا، اور فیروزہ تیر کی طرح سیدھی اس کے

کمرہ میں پہنچی، جب وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا، تو میرے پاس آیا، وہ بیٹھا میرے پاس تھا، لیکن اس کی آنکھیں گھر کے ایک ایک کونہ میں، دیوار پر، میز کے نیچے، الماری کے اندر، پردہ کے پیچھے، فیروزہ کو تلاش کر رہی تھیں، میں سمجھ گئی میں نے کہا:

"کوئی چیز گم گئی ہے کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

"نہیں تو یوں ہی چلا آیا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"لیکن یہ فیروزہ کا کمرہ نہیں ہے، "یوں ہی" جانے کا تمہیں وہاں حق ہے، یہاں تم "یوں ہی" نہیں آ سکتے"

وہ جھینپ سا گیا، کہنے لگا:-

"آپ کو غلط فہمی ہے"

میں نے جواب دیا:-

عورت کی کائنات ہی غلط فہمی ہے، غلط فہمی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی"

وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا، کہنے لگا:-

"خوب بات کہی آپ نے!—— لیکن وہ ہیں کہاں؟"

میں نے پوچھا،

"فیروزہ کو پوچھ رہے ہو نا؟"

"جی ہاں انھیں کو!"

"وہ تو گئی"

"کہاں"

"لاہور، کالج کی چھٹیوں میں آئی تھی، چھٹیاں ختم ہوگئیں، کئی روز سے جانے جانے کو کہہ رہی تھی، آج چلی گئی، میں تو بہت روکتی رہی کہ دو چار دن اور ٹھہر جا، لیکن اس کے سر پر تو سفر کا بھوت سوار تھا ایک نہ مانی چل کھڑی ہوئی"

جیشہ کا ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا، یہ خبر میرے بجائے اگر گھر کے کسی نوکر نے اُسے دی ہوتی، تو وہ ضرور اسے مار بیٹھتا، اتنا جلا ہوا تھا اس وقت کچھ دیر چپ رہا، پھر آپ ہی آپ کہنے لگا:-

"لیکن مجھ سے تو انھوں نے بالکل ذکر نہیں کیا جانے کا!"

میں نے تیوریاں چڑھا کر، اور اپنے چہرے پر غصہ کی کیفیت پیدا کر کے کہا:-

"کچھ ہوش میں ہو؟ تم سے ذکر کیوں کرتی؟ تمہاری کون ہوتی ہے وہ؟ بڑے حضرت ہو کیا اس پر ڈورے ڈال رہے تھے تم؟ یاد رکھنا وہ بڑی شریف لڑکی ہے، تمہارے جھانسوں میں آنے والی نہیں ہے، تمہیں عشق و محبت کا سوانگ رچانا ہے تو اتنا بڑا شہر پڑا ہے ڈھونڈھ لو کسی کو، لیکن میری فیروزہ پر رحم کرو"

وہ سٹ پٹا گیا، کوئی جواب نہ بن آیا اس لئے وہ کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا :-

"کہاں جارہے ہو، بیٹھو "

وہ بیٹھ گیا ، میں نے کہا :

" مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں "

" فرمایئے "

"کیا تم فیروزہ سے محبت کرتے ہو ؟"

کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر اس نے جی کڑا کر کے کہا :-

"کرتا تو ہوں محبت"

"کس سے اجازت لی تم نے ؟"

اِسے ہنسی آگئی ، لیکن اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے اس نے کہا :-

" محبت اجازت لے کر کب کی جاتی ہے ؟"

" میرے گھر میں بغیر میری اجازت کے کوئی کسی سے محبت نہیں کر سکتا ، اور خاص کر تم !"

" یہ کیوں ؟"

" تم اس وقت تک محبت نہیں کر سکتے ، جب تک سیٹھ صاحب کو گلفام نہ بنا دو ، جب تم اپنا یہ معمولی سا وعدہ نہ پورا کر سکے تو زندگی بھر فیروزہ کے ساتھ کیا خاک نباہ سکو گے ؟"

وہ سمجھ گیا ، میں مذاق کر رہی ہوں ، پھر اُس کے چہرے پر وہی رونق آگئی ، جو اُس کا خاص حصہ تھی ، اس نے بڑی بے تکلفی سے دریافت کیا :

" بتایئے تو فیروزہ کہاں ہے ، کیا واقعی چلی گئی ؟"

میں ابھی کوئی جواب نہ دینے پائی تھی کہ فیروزہ اپنے خریدے ہوئے سامان سے لدی پھدی آتی دکھائی دی ، اُسے دیکھتے ہی جمشید کا چہرہ پھول کی طرح کھل اُٹھا کہنے لگا :

خوب مذاق کرتی ہیں آپ ! فیروزہ تو وہ آرہی ہے "

اب فیروزہ ہمارے درمیان آچکی تھی ، وہ اپنے کمرہ کی طرف جا رہی تھی ، کہ میں نے اُسے ٹوکا :-

" فیروزہ اِدھر آؤ !"

وہ چلی آئی ، میں نے کہا :-

" بیٹھ جاؤ "

وہ میرے پاس بیٹھنے لگی ، میں نے اسی سخت لہجہ میں کہا :-

" میرے پاس نہیں جمشید کے پاس بیٹھو "

سٹ پٹائی تو بہت ، لیکن بیٹھ گئی - جمشید کے پاس ، میں نے کہا :-

" بڑی نالائق ہو تم ؟"

" کیوں کیا ہوا ؟"

" کیوں پریشان کر رکھا ہے جمشید کو تم نے ؟"

" میں نے ؟"

" اور کیا میں نے ؟"

" کچھ کہو تو کیا ہوا ؟"

"اتنی دیر سے جمشید بیٹھے ہوئے تمہارا ہی رونا رو رہے تھے۔"

اُس نے اچٹتی ہوئی نگاہ جمشید پر ڈالی، پھر مجھ سے کہنے لگی:-

"کیا رونا رو رہے تھے میرا؟"

"کہہ رہے تھے، تو نے ان کا اُٹھنا بیٹھنا دوبھر کر دیا ہے ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی ہے، اور چھیڑ چھیڑ کے عشق و محبت کی باتیں کرتی رہتی ہے، مروت کے مارے کچھ نہیں کہتے، لیکن بہت وقت ضائع ہوتا ہے بیچارے کا، یہی شکایت کر رہے تھے ـــ، اور ہاں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اپٹوڈیٹ جنٹلمین ہونے کے باوجود ذرا قدامت پرست واقع ہوئے ہیں، عورت کے اظہارِ عشق کو اور وہ بھی بے محابا پسند نہیں کرتے ــــــــــــ اری کمبخت تو یہاں آئی ہے تو کیا میرے منہ پر کالک لگا کے جائے گی، کیا منہ دکھاؤں گی تیرے ماں باپ کو جب وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ ہم نے اپنی لڑکی کو تیرے پاس بھیجا تھا، اور تو نے جمشید کے حوالہ کر دیا، بول کیا جواب دوں گی میں؟"

وہ ہنسنے لگی، جمشید کے پاس سے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی، کہنے لگی:-

"بڑی شریر ہو تم؟"

میں نے کہا:-

"میں زیادہ شریر ہوں یا تم؟ اس کا فیصلہ جمشید پر چھوڑ دو۔ کیوں جمشید! سچ کہنا ہم دونوں میں زیادہ شریر کون ہے؟"

جمشید نے جواب دیا:-

"کوئی نہیں۔"

وہ بڑے زور سے ہنسی، کہنے لگی:-

"ڈرپوک کہیں کے، کتنی آسانی سے پیچھا چھڑا لیا۔"

جمشید ہنسنے لگا، پھر وہ اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا،

میں نے کہا:-

"اتنی بے قراری بھی کیا، بیٹھو کچھ دیر یہاں، فیروزہ وہاں بھی ہوگی فیروزہ یہاں بھی ہے، وہاں تم اکیلے ا...ے دیکھو گے یہاں تمہارے ساتھ میں بھی دیکھ رہی، اپنی چہیتی لاڈلی سہیلی کو!"

پھر وہ بیٹھ گیا، جیسے اسکول کی چھٹی کے بعد کوئی لڑکا کھیلنے جا رہا ہو، اور ماسٹر اسے حکم دے "تم نہیں جا سکتے فیلڈ کی طرف، بیٹھو سبق یاد کرو"

جمشید کی اس بے بسی پر مجھے اور فیروزہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی!

باب ۲۰
نیا باب

فیروزہ کی چھٹیاں اب ختم ہو چکی تھیں، لاہور سے خط پر خط آ رہے تھے، کہ چلی آؤ، وہ جانا نہیں چاہتی تھی، لیکن جانے پر مجبور تھی، ماں باپ کو کیسے چھوڑ دیتی! جب جانے میں دو تین روز رہ گئے تو میں نے دیکھا، فیروزہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہے، ذرا سی کوئی بات ہوئی اور وہ رو دی، جمشید نے مطب جانا بالکل چھوڑ دیا تھا، ہر وقت گھسا رہتا تھا، دونوں یہ چاہتے تھے کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ایک دوسرے کے پاس صرف کریں، پھر نہ جانے کب ملنا ہو ایک دوسرے سے مل بھی سکیں گے یا نہیں، یہی فکر تھی جس نے دونوں کو ہراساں اور سراسیمہ کر رکھا تھا؛

اتوار کے روز ہم لوگ کہیں نہ کہیں سیر سپاٹے کو ضرور نکل جاتے تھے اس دفعہ بھی ہم، ایک ساحلی تفریح گاہ پر گھومنے اور سیر کرنے کے لئے گئے ہم تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، میں فیروزہ کی جدائی کے

خیال سے مغموم تھی، اس لئے خاموش تھی، فیروزہ کو جمشید سے بچھڑ جانے کا غم تھا، اس لئے چپ چپ تھی، جمشید کو بساط محبت کے الٹ جانے کا اندیشہ تھا، اس لئے کھویا کھویا سا تھا، ہم تینوں چلے جا رہے تھے ناک کی سیدھ پر، لیکن ایک دوسرے سے بالکل مخاطب نہیں تھے،

چلتے چلتے اب ساحل ریت کے وسیع میدان کے ایک گوشے پر پہنچ کر میں ٹھٹکی، میں نے کہا:

کب تک چلتے رہو گے، ہم تو تھک گئے بھئی، آؤ ذرا دیر یہاں بیٹھیں"

میرے ساتھ وہ دونوں بھی بیٹھ گئے، پہلے چل رہے تھے، لیکن خاموش تھے، اب بیٹھے ہوئے تھے، لیکن الگ الگ، چپ چپ، کچھ دیر تو میں خاموش سی بیٹھی رہی، پھر مجھے خیال آیا، یہ دونوں جلد بچھڑنے والے ہیں، میں ان کے حلق کا کانٹا کیوں بنوں؟ انھیں موقعہ دینا چاہیئے کہ آپس میں جتنی باتیں کر سکتے ہیں، جی بھر کے کر لیں، میں اٹھی میں نے فیروزہ سے کہا:

"تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں!"

اس نے سنا بھی نہیں میں نے کیا کہا؟ جمشید نے میری طرف دیکھا لیکن وہ بھی خاموش ہی رہا، اخلاقاً وہ مجھے روکنا چاہتا تھا، لیکن اس کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا، کہ میں چلی جاؤں، تاکہ اطمینان سے وہ دل کا سارا چھید کر پریم کا راگ سنائے اپنی محبوبہ کو۔

تھوڑی دیر تک میں اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی، واپس آئی تو دیکھا دونوں اب بھی خاموش ہیں، فرق جو کچھ ہے وہ یہ کہ فیروزہ اور جمشید دونوں کی آنکھیں معلوم ہوتا تھا، روتے روتے سوج گئی ہیں، میں نے حیرت سے کہا:

"ارے یہ کیا؟ رو رہے ہو تم دونوں؟"

جمشید تو ضبط کر گیا، لیکن فیروزہ واقعی رونے لگی۔

میں پاس بیٹھ گئی، میں نے کہا:

"آخر کیا بات ہے، کیوں رو رہی ہے تو پگلی؟"

میرا اتنا کہنا اور قیامت ہو گیا، اب وہ بلک بلک کر رونے لگی، میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا:

تم لاہور جا رہی ہو، دُنیا سے تو نہیں جا رہی ہو، تم دونوں میں محبت ہے، کچھ دشمنی تو نہیں ہے، پھر اس رونے سے کیا حاصل، فیروزہ کے آنسو ذرا ذرا تھم چکے تھے، وہ گریہ آلود آواز میں کہنے لگی:

"نہ جانے اب کب ملنا ہو؟"

مجھے ہنسی آ گئی، میں نے کہا:

"اے ہے تو یہ میرے غم میں آنسو بہائے جا رہے تھے، بڑی خوش قسمت ہوں میں ـــــ نہ ہوئی میں جمشید ورنہ اسی وقت تجھے بھگا لے جاتی اپنے ساتھ دور کہیں دور، بہت دور، شفق کے اُس پار دُور کسی وادی میں، کسی کنج میں، کسی پربت پر اپنا ڈیرا ڈالتی اور پریم کا

راگ گاتی۔ تجھے مورتی بنا کر پوجتی!"

فیروزہ کی شوخی پھر لوٹ آئی، وہ مسکرائی کہنے لگی:

"تم ایکٹریس کیوں نہیں بن جاتیں؟ سچ بڑی اچھی لگو گی"

"ڈائرکٹر بننے میں جو مزہ ہے وہ ایکٹر یا ایکٹریس بننے میں کہاں ہے۔ میری ہی ڈائرکشن میں تم دونوں پریم کا ناٹک کھیل رہے ہو!"

جمشید اب بھی چپ بیٹھا ہوا تھا، میں نے کہا:

"کیا تیرے جمشید کو سانپ سونگھ گیا ہے، یہ بولتے کیوں نہیں؟ اب انہیں چپ لگی ہے، تو تیرے جانے کے بعد تو یہ بولنا بالکل ہی بھول جائیں گے!"

"اپنے وجود کی قدر و قیمت کا فیروزہ کو احساس ہوا، یہ احساس عورت کی سب سے بڑی متاع ہے، میرے یہ الفاظ سنتے ہی اس کے چہرہ پر بحالی آ گئی ہنس کر کہنے لگی:-

"بھول کیوں جائیں گے؟ تم بن جانا میری قائم مقام"

فیروزہ نے یہ جملہ بڑی معصومیت سے کہا تھا، لیکن جمشید بھی چونک پڑا اور میں بھی گھبرا گئی، جس دروازہ کو بند کر چکی تھی، نادانستہ طور پر فیروزہ نے دھکا دے کر اسے پھر کھول دیا تھا، جمشید کے چہرے سے بھی یہ معلوم ہو رہا تھا، جیسے بھولا ہوا خواب اسے یاد آ رہا ہے، میں نے اپنے دل کے کھلے ہوئے دروازہ کو زور لگا کر پھر سے بند کر لیا، گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے میں نے کہا:-

"اچھا یہ تو بتاؤ، تم دونوں نے سوچا کیا ہے!"

"کاہے کے بارے میں؟" فیروزہ بولی،

"لے اب اتنی ننھی تو نہ بنو۔"

"تو بتاؤ نہ صاف صاف"

"تم دونوں کے اس لگاؤ کا کچھ تھل بیڑا لگے گا یا نہیں؟ یہ کوئی بات ہوئی، آئیں محبت کی، اور چل دیں چپ چاپ، اس کا نتیجہ، اس کا انجام، کچھ ہوگا بھی یا نہیں؟"

وہ سنجیدہ ہوگئی، کہنے لگی:

"تو بتاؤ تم کوئی راستہ۔"

"مجھے کیا پڑی ہے، تم دونوں سمجھدار ہو، خود سوچو!"

"ہمارے (مسکرا کر) نانک کی ڈائرکٹر تو تم ہو، جو کہو گی وہ کریں گے"

"میری بات مانو تو آسان ترکیب یہ ہے کہ جمشید کو اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔"

"اپنے ساتھ لیتی جاؤں؟ یہ کیسے؟"

"یہی تو بہترین ترکیب ہے۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آیا بھئی۔"

"بے وقوف تو ہو ہی تم!"

"بے وقوف سہی لیکن سمجھا دو، اپنی بات ہمیں ——— ہاں!"

"تم لاہور جاؤ ——— کہو ہاں!"

"ہاں میں لاہور گئی ——— پھر!"

"تمہارے پیچھے پیچھے جمشید بھی لاہور چلے جائیں ——— کہو ہاں!"

"کہہ دیا ہاں، ——— لیکن یہ وہاں جاکر کریں گے کیا؟"

"جو یہاں کرتے ہیں!"

تمہارا مطلب یہ ہے کہ کلیانی کے بجائے یہ لاہور میں پریکٹس شروع کردیں؟"

"ہاں صرف یہی مطلب ہے، اور کچھ نہیں، کہو تو قسم کھالوں؟"

"پھر کیا ہوگا؟"

"وہی جو یہاں ہو رہا ہے!"

"تم جانتی ہو ڈیڈی کتنے سخت مزاج ہیں، وہ شاپور سے میری شادی کردینا چاہتے ہیں!"

"وہ چاہتے ہیں تو تو نہیں چاہتی؟"

"اے واہ میں کیوں چاہنے لگی۔"

"بس وہاں بیماری کا ڈھونگ رچاکر یا کسی اور طرح جمشید کو موقع دینا کہ وہ تمہارے ہاں رسائی حاصل کرلے، پھر سب کام خود بخود بن جائیں گے!"

"اور ڈیڈی؟"

"کیوں سہمی جارہی ہے، کیا کھا جائیں گے وہ تجھے؟"

"تم نہیں جانتیں ان کا غصہ خراب ہے۔"

لیکن جمشید کا مزاج تو بہت اچھا ہے، وہ رام کریں گے تمہارے ڈیڈی کو۔"

یہ بات فیروزہ کی سمجھ میں آگئی، تھوڑی دیر چپ رہی، پھر مجھ سے کہنے لگی :۔

"یہ بھی تیار ہیں، لاہور جانے پر؟"

"واہ ری بگلی، مجھ سے کیا پوچھتی ہے، پوچھ لے انہی سے بیٹھے تو ہیں، دھونی رمائے تیرے سامنے!"

وہ ہنس پڑی کہنے لگی :۔

"یہ ہنسی کا موقع نہیں ہے، بتاؤ نا!"

میں نے کہا :۔

"واہ ری، ہنس خود رہی ہے، منع مجھے کر رہی ہے، میں کیا بتاؤں ______ "بولو بھئی جمشید تمہاری کیا رائے ہے"!

وہ حضرت نہ جانے کہاں تھے، چونک کر کہنے لگے :

"ایں ؟ ______ کیا ______ کیا ہوا ؟"

جمشید کی اس محویت پر ہم دونوں ہنس پڑے، پھر میں نے ساری اسکیم از سرِ نو اُسے سُنائی، وہ کہنے لگا

"آپ مجھ سے اتنی اُبھ گئیں ؟ نکالے دے رہی ہیں اپنے شہر سے؟"

میں نے کہا :۔

تمہیں زندگی فیروزہ کے ساتھ گزارنی ہے، میں وہ ترکیب بتا رہی

ہوں کہ آسانی سے تم دونوں ایک ہو سکو، اور سکھ کی زندگی بسر کر سکو!"

بڑی دیر تک اس اسکیم کے مختلف پہلوؤں پر ہم لوگ بحث کرتے رہے، آخر میں یہ اسکیم منظور ہوگئی، اور طے پایا کہ فیروزہ لاہور جائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جمشید چلا جائے، ریل پر دونوں ایک دوسرے کے رفیق زندگی رہیں، اور لاہور کے اسٹیشن پر اجنبی بن جائیں وہاں نئے سرے سے رسم و راہ پیدا کی جائے اور فیروزہ کے ڈیڈی کو ہموار کر کے شادی کا پیام حاصل کیا جائے، روپیہ کی دونوں طرف کمی نہیں تھی، لہٰذا اس دین کے سوال پر معاملہ کے ختم ہو جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا!

چوتھے روز فیروزہ لاہور روانہ ہوگئی اسی ٹرین پر جمشید بھی سفر کر رہا تھا۔

فیروزہ کے جانے کے بعد میرا گھر پھر سنسان ہوگیا، اُداسی اور افسردگی پھر مجھ پر طاری ہوگئی، جمشید کی کمی بھی میں محسوس کر رہی تھی درحقیقت اسے لاہور بھیجنے کی میں ذمہ دار تھی، میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ فیروزہ کے جانے کے بعد ایک دن بھی ہمارے گھر میں رہے، مجھے اندیشہ تھا اگر وہ رہ گیا، تو شاید میں متزلزل ہو جاؤں، اُس سے محبت کرنے لگوں، میں اپنے اصول پر پہاڑ کی طرح جمی ہوئی تھی، لیکن جمشید کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے عزم کا پہاڑ پتھر کا نہیں موم کا ہے اُسے اپنی جگہ سے ہلایا جا سکتا ہے، توڑا جا سکتا ہے!

کرتا ہے، سچ کہتی ہوں بعض دفعہ تو تم پر شک ہونے لگتا ہے، کیا کر دیا ہے تم نے جمشید پر، جب دیکھو جب تمہارا کلمہ پڑھ رہا ہے،

ہماری کتاب زندگی کا نیا باب شروع ہوا ہے، دعا کرو، باب ہمیشہ اُتنا ہی شاندار رہے جتنا اب ہے، یہ جو کچھ ہے، تمہارا کرم ہے، یہ نعمت تمہاری ہی دی ہوئی ہے، تم اگر ڈائرکٹر نہ ہوتیں تو ہمارے جیون کا یہ ناٹک کامیڈی نہ بن جاتا، ٹریجڈی ہی رہتا، کتنی اچھی ہو تم جی چاہتا ہے، اپنا دل چیروں اور تمہیں اس میں بٹھالوں۔ تمہاری

فیروزہ

یہ خط پاکر مجھے خوشی ہوئی، لیکن یہ دیکھ کر مجھے رنج ہوا کہ جمشید کے دل میں ابھی تک میری یاد باقی ہے، فیروزہ کی کتاب زندگی کا نیا باب شروع ہو رہا تھا، وہ بھی خوش تھی اور میں بھی اس کی خوشی میں برابر کی شریک تھی، لیکن میری کتاب زندگی کا جو باب پہلی بار سیٹھ صاحب نے کھولا تھا، وہ آج تک کھلا ہوا ہے ختم ہی نہیں ہوتا۔ ختم ہوگا یا نہیں، یہ سوچ کر میں افسردہ ہوگئی، میں اپنے غم کی تنہا مالک تھی۔ میرا شریک غم کوئی نہ تھا!

خوشی کے شریک مل جائیں تو وہ بڑھ جاتی ہے، غم کے ساتھی ملیں تو وہ کم ہو جاتا ہے، میرے غم کا ساتھی کوئی نہ تھا، اس اتھاہ سمندر میں بے یار و مددگار میں ڈبکیاں کھا رہی تھی،

فیروزہ کی جدائی اور جمشید کی "جلاوطنی" نے مجھ پر افسردگی تو ضرور طاری کر دی، لیکن دل کی آسودگی بھی محسوس کر رہی تھی، اب میرے اور سیٹھ صاحب کے درمیان کوئی ایسی ہستی نہیں تھی جو ہمارے راستہ کا پتھر بن سکے، مجھے بہکا سکے، میرے دل پر ڈاکہ ڈال سکے، یہ بہت بڑا اطمینان تھا، اور اسے پاکر میں بے انتہا خوش تھی۔

میری خط و کتابت فیروزہ سے جاری تھی، جمشید نے اُس کے "ڈیڈی" پر اچھا خاصہ اثر جما لیا تھا، وہ دمہ کے پُرانے مریض تھے، جمشید کی ایک ہی خوراک نے انھیں اچھا کر دیا، فیروزہ اپنے باپ کی صحت سے اتنی خوش نہیں تھی، جتنی جمشید کی اس کامیابی سے، وہ اگر کسی اور کے علاج سے اچھے ہوتے، تو ذرا بھی مسرت نہ ہوتی، اور اگر جمشید کے علاج سے وہ مر بھی جاتے، تو اسے کچھ بہت زیادہ رنج نہ ہوتا،

ایک روز مجھے فیروزہ کا خط ملا!

"پیاری شیریں"

تمھیں ایک خوش خبری سناتی ہوں، میں جمشید کی ہوگئی وہ میرا ہوگیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جمشید کی ایک دراکی پڑیا نے وہ کام کیا، جو نہ اُس کا حسن کر سکتا تھا، نہ دولت، شاپور منہ دیکھتا رہ گیا، اور میں جمشید کی بن گئی۔

بڑی محبت سے رہ رہے ہیں ہم دونوں، کاش یہ محبت کا رنگ زندگی بھر پھیکا نہ پڑے، تم بہت یاد آتی ہو، جمشید بھی تمہیں بہت یاد

باب ۲۱
شفقت پدری

سیٹھ صاحب اپنے بختاور کے ساتھ مگن تھے، اور میں اپنی ذہنی اُلجھنوں میں گرفتار تھی۔ کبھی کبھار ملاقات ہوگئی۔ دو چار رسمی باتیں ہوئیں اور معاملہ ختم، سچ تو یہ ہے کہ اُس محبت اور تعلق کے باوجود جو مجھے سیٹھ صاحب سے تھا، اور اُس خدمت کی لگن کے باوجود، جو میرے دل میں سیٹھ صاحب کے لئے تھی، میں خود یہ چاہتی تھی کہ میرا اُن کا زیادہ آمنا سامنا نہ ہو، اگر کبھی موقعہ ملتا بھی تھا، تو میں کترا جاتی تھی؛

بختاور کے حالات جب تک مجھے معلوم نہیں ہوئے تھے، سیٹھ صاحب اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود، میرے لئے سب کچھ تھے، میں اُن سے محبت بھی کرتی تھی، اور ان کی عزت بھی کرتی تھی، جب سے بختاور پر وہ لٹو ہوئے تھے، میرے دل سے ان کی محبت بھی کم ہونے لگی تھی، اور عظمت بھی رخصت ہوتی نظر آرہی تھی، میں ان

دونوں کو اپنے دل میں قائم رکھنا چاہتی تھی، یہی وجہ تھی کہ میں اُن کے خیال کو کم سے کم اپنے دل کے دربار میں باریابی کا موقع دیتی تھی، اور ان سے زیادہ ملنے میں بھی تامل کرتی تھی۔

فیروزہ اور جمشید نے مجھے ایسا بہلا رکھا تھا، کہ مجھے سیٹھ صاحب کے بارے میں کوئی خیال ہی نہیں آتا تھا، اب یہ دونوں چلے گئے تھے پھر بیکاری میں اور کچھ نہیں تو ان کے خیال ہی سے کشتیاں لڑنے لگی، میں نے سوچا، جس طرح میں زندگی بسر کر رہی ہوں، یہ ٹھیک نہیں ہے، سیٹھ صاحب سے کوئی اُمید نہیں ہے، اگر میں یونہی چپ بیٹھی رہی تو میرے دل پر تنہائی اور بے کاری کے سبب خیالات فاسد کے جوڑ کے پڑتے رہتے ہیں، ان کا سلسلہ بڑھ جائے گا، اور میرے لئے اپنے تئیں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا، یہ سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا، کہ جو یہ خدمت رکھنے والی نوجوان ہواؤں کے لئے "جو تربیت گاہ" میں بنانا چاہتی تھی اُسے جلد از جلد تکمیل تک پہنچا دوں، اس طرح ایک مشغلہ میرے ہاتھ آجائے گا، میرا دل بہلا رہے گا، اور خیالات فاسد کے حملوں کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔

یہی سب سوچ کر، میں کچھ سہمی ہوئی اور کچھ جھجکتی ہوئی سیٹھ صاحب کے کمرہ میں گئی، وہ اس وقت تنہا بیٹھے ہوئے حساب کتاب دیکھ رہے تھے، میں جا کر ان کے پاس بیٹھ گئی، اُنھوں نے نظر اُٹھا کر مجھے دیکھا، چشمہ بند کیا، عینک اُتار کر خانہ میں رکھی، اور بڑی شفقت کے ساتھ اُنھوں نے

دریافت کیا:۔

"کوئی کام ہے؟"

میں نے آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا:۔

"جی ہاں بڑا ضروری"!

وہ اور زیادہ سراپا شفقت بن گئے، انھوں نے مجھے ایک دفعہ گھورا، پھر فرمایا:۔

"تو کہو نا؟"

میں نے کہا:۔

"میں چاہتی ہوں، وہ تربیت گاہ جلد از جلد قائم ہو جائے آپ نے وعدہ بھی تو کیا تھا؟"

"ضرور، تو دیر کیا ہے، میں تو سمجھا تھا کہ تم بھول بھی گئیں اس خیال کو؟"

"جی نہیں یہ بات تو نہیں ہے، میں بھولی تو نہیں تھی، فیروزہ کی وجہ سے ایسی اُلجھی ہوئی رہی کہ فرصت ہی نہ ملی، اب وہ گئی تو سب سے پہلے یہی خیال آیا!"

"ٹھیک ہے اور وہ جمشید کہاں چلا گیا؟"

"آپ سے تو کہہ کے گیا تھا کہ لاہور جائے گا وہیں مطب کرے گا!"

"ہاں اُس نے کہا تو تھا، لیکن یہ لاہور جانے کی اُسے کیا سوجھی؟"

"وہاں تو اس کی شادی بھی ہو گئی"

"ایں کس سے؟"

"فیروزہ سے!"

سیٹھ صاحب کے چہرے پر کچھ برہمی کے آثار پیدا ہوئے۔

کہنے لگے: "بدمعاش لونڈا!"

میں نے کہا:۔

"ہوگا ہمیں کیا ——— ہاں تو بتائیے نا، تربیت گاہ؟"

سیٹھ صاحب مسکرائے، بوڑھے بھی بالکل بچوں کے سے ہو جاتے ہیں، ذرا میں خوش، ذرا میں خفا، ابھی خفا تھے، ابھی خوش ہو گئے۔

کہنے لگے:۔

"ہاں بھئی یہ کام تو ضرور شروع کر دو، اور بہت جلد، میں بھی اس کام سے بڑی دلچسپی لوں گا، اور تربیت گاہ کے کاموں میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا!"

اگر میری شادی جمشید یا کسی اور نوجوان سے ہوئی ہوتی، اور میں نوجوان عورتوں کے لئے کوئی ادارہ قائم کرتی، اور جمشید اُس میں میرا ہاتھ بٹانے کا ارادہ ظاہر کرتے، تو میں انہیں دور دور رکھتی لیکن سیٹھ صاحب بے ضرر آدمی تھے وہ لڑکیوں اور عورتوں کے گروہ میں گھرے رہتے تو بھی نہ مجھے ان کے تقدس پر کوئی شبہ ہوتا نہ میں بُرا مانتی، میں نے اُن کی یہ پیش کش قبول کر لی،

"ہاں ہاں ضرور، آپ اگر میرا ہاتھ بٹائیں گے تو ضرور مجھے کامیابی ہوگی۔!"

اس وقت میرے چہرے پر سچی خوشی کی چمک جھلک رہی تھی۔ میں نے دیکھا تھوڑی دیر کے لئے سیٹھ صاحب کی آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہوئی، لیکن فوراً ہی وہ زائل ہوگئی، جیسے راکھ میں پڑی ہوئی کوئی چنگاری ہلکی سی لَو دے، اور خاموش ہو جائے،

ان کی بے بسی پر پھر میرا دل کُڑھنے لگا، میں نے بڑی محبت کے لہجہ میں کہا:

"آپ کتنے اچھے ہیں!"

وہ مسکرا دیئے کہنے لگے:-

"اچھی تم ہو کہ اتنا اچھا اور نیک کام کر رہی ہو!"

"واہ! اور آپ؟ آپ ہی کے بل پر تو یہ کام کر رہی ہوں میں ورنہ میں خود اس وقت کسی تربیت گاہ میں دن کاٹ رہی ہوتی!"

"ایسی باتیں نہ کیا کرو، ان سے مجھے تکلیف ہوتی ہے!"

میں نے کہا:-

"نہیں کروں گی اب سے ایسی باتیں لیکن،

اَیاز قدر خود شناس

کے فلسفہ سے میں ناواقف نہیں ہوں!"

میں نے محسوس کیا، سیٹھ صاحب میری اس فروتنی اور نیازمندی سے بہت خوش ہوئے، پھر اُنھوں نے عینک کا خانہ کھولا، اور عینک نکال کر صاف کرنے لگے!

تھوڑی دیر کے بعد سیٹھ صاحب میرے کمرہ میں تشریف لائے میں نے سر و قد کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا، وہ میرے پاس بیٹھ گئے اور بڑی دیر تک شفقت و محبت کی باتیں کرتے رہے، میرے والد زندہ تھے، لیکن اس گھر میں آنے کے بعد میں شفقت پدری سے تقریباً محروم ہو چکی تھی، وہ بہت کم آتے تھے، میرے پاس، اور میرا تو جانا گویا بالکل نہیں ہوتا تھا، آج سیٹھ صاحب کی ان شفقت بھری باتوں میں مجھے شفقت پدری کا لطف آ رہا تھا۔

سیٹھ صاحب نے مجھے ۲۰ ہزار کا چیک دیا، اور فرمایا یہ رقم ابتدائی انتظام کے لئے تم پوری مستعدی سے تیاریاں شروع کر دو ایک وسیع کوٹھی بھی سیٹھ صاحب نے وقف کر دی، فرمایا:- یہ کوٹھی بورڈنگ اور تربیت گاہ دونوں کا کام دے گی۔

آج میں بہت خوش تھی، اب تک میں بھٹک رہی تھی، آج مجھے منزل کا نشان مل گیا، آج وہ راستہ مجھے مل گیا تھا، جس پر چل کر میں کامیابی کی منزل مقصود تک پہنچ سکتی تھی، میں سوچ رہی تھی اس تربیت گاہ سے نوجوان بیوائیں، جذبۂ خدمت سے سرشار ہو کر نکلیں گی، اور اپنے دیس کی سیوا کریں گی، میرے لئے اس تربیت گاہ کی عمارت ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ ثابت ہوگی، اس قلعہ میں جب میں پہنچ جاؤں گی، تو خیالات فاسد کی فوجیں مجھ پر حملہ نہیں کر سکیں گی، اس کی فصیل سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر لوٹ جائیں گی، جب سے میں سیٹھ صاحب کے گھر آئی تھی۔

اتنی خوشی مجھے کبھی نہیں ہوئی تھی، جتنی آج تھی،

شام کو میں کسی کام سے سیٹھ صاحب کے کمرہ کی طرف گئی، دروازہ پر پہنچ کر، میں رُک گئی، میں نے بختاور کی ہنسی کی آواز سُنی، کان لگائے تو معلوم ہوا، سیٹھ صاحب بڑے انہماک سے اُس سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں،

میری خوشی پھر کافور ہوگئی، غم کے اتھاہ سمندر میں، پھر میں ڈبکیاں کھانے لگی، میں دبے پاؤں اپنے کمرہ میں واپس آئی، اور منہ ڈھانپ کر رونے لگی، میں سمجھ گئی، میری قسمت میں خوشی ہے ہی نہیں، مجھے جب تک زندہ رہنا ہے، غم کی زندگی بسر کرنا ہے۔

میرا جی چاہ رہا تھا سیٹھ صاحب کا چیک انھیں واپس کردوں اور کہہ دوں، میں نہیں قائم کرتی تربیت گاہ، جب میں اپنے گھر کی اصلاح نہیں کر سکتی، تو غیروں کو کیا ٹھیک کروں گی، جب میں اپنے شریک زندگی کو نہیں سدھار سکتی، تو انھیں کیونکر سدھاروں گی جن سے میرا کوئی رشتہ ناطہ نہیں ہے، پھر خیال آیا، اپنوں سے غیر اچھے ہوتے ہیں، تربیت گاہ قائم ہونے کے بعد، شاید کچھ ایسی ہستیاں مل جائیں جو ہم مذاق ہوں، پھر میں انہی کے ساتھ رہوں گی، سیٹھ صاحب کو چھوڑ دوں گی، اور دیس کی سیوا کرتے کرتے ایک دن مرجاؤں گی،

پھر مجھے ڈھارس بندھی، پھر میں تربیت گاہ کے خاکے بنانے لگی۔

باب ۲۲
تربیت گاہ

میں نے اشاعت کے لئے اخبارات میں اشتہار دے دیا۔ تربیت حاصل کرنے والی لڑکیوں کی درخواستیں بھی تربیت گاہ کے اشاعت کے لئے شرط یہ تھی کہ وہی عورت تربیت گاہ کے اشاعت میں شامل ہوسکتی ہے، جو لاولد ہو اور تربیت گاہ کی لڑکیوں کو اپنی اولاد کی طرح پالے پوسے، اُمیدوار لڑکیوں کے لئے شرط یہ تھی کہ وہی لڑکی اس تربیت گاہ میں داخلہ کی درخواست بھیج سکتی ہے، جو نوجوانی میں بیوہ ہوگئی ہو، اور اپنی آئندہ زندگی صرف وطن اور اہل وطن کی خدمت میں بسر کرنا چاہتی ہو، دوبارہ شادی کرنے کا ارادہ نہ رکھتی ہو، اشاعت کے لئے میں نے معقول تنخواہ رکھی تھی، اور اُمیدوار لڑکیوں کو میں نے بہت زیادہ سہولتیں دی تھیں نتیجہ یہ ہوا، کہ اشتہار دیتے ہی درخواستوں کا تانتا لگ گیا،

تھوڑے ہی دنوں میں اشاعت بھی مکمل ہوگیا، اور طالبات کی

تعداد بھی دو درجن سے بھی متجاوز ہو گئی، اس تربیت گاہ میں قوم و مذہب کا کوئی امتیاز نہیں تھا، اس لئے اسٹاف میں اور طالبات میں ہر مذہب و ملت کی عورتیں اور لڑکیاں شریک تھیں۔

میں اپنا سارا وقت تربیت گاہ کو دے رہی تھی، سیٹھ صاحب بھی پورے انہماک کے ساتھ میرا ہاتھ بٹا رہے تھے، ہم دونوں کے اشتراک عمل نے بہت جلد تربیت گاہ کو ایک کامیاب ادارہ بنا دیا۔

میں پرنسپل کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ماہرو آئی، یہ بڑی ذہین اور ہونہار لڑکی تھی، ۲۰ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی، سوتیلی ماں نے گھر کے دروازے بند کر لئے اور سسرال والوں نے بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہماری تربیت گاہ اُسے جنت معلوم ہوئی، وہ سیدھی یہاں چلی آئی بڑی پیاری لڑکی تھی، اور خوبصورت بھی بہت تھی، فرض کی بجا آوری کا جتنا احساس میں نے ماہرو میں دیکھا کسی میں نہیں دیکھا، تربیت گاہ کی تمام اُستانیاں اس کی مدّاح و معترف تھیں، پڑھی لکھی کم تھی، زیادہ وقت تحصیل علم میں صرف کر رہی تھی، وہ اپنی ساری زندگی —— دکھیا غریب اور نادار بہنوں کی خدمت میں صرف کر دینا چاہتی تھی۔

میں نے ماہرو سے کہا: "جی لگتا ہے تمہارا یہاں؟"

"اتنا جی تو گھر میں بھی نہیں لگتا تھا۔"

"کوئی شکایت تو نہیں ہے تمہیں یہاں کے انتظام سے؟"

"جی بالکل نہیں۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سیٹھ صاحب تشریف لائے، ماہرو ادب سے خاموش ہو گئی، اور میں نے ان سے درخواست کی کہ تشریف رکھیں، وہ ماہرو کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگے:

"منّی تم بھی یہاں رہتی ہو؟"

"جی ہاں۔"

میں نے ماہرو کا اچھی طرح سیٹھ صاحب سے تعارف کرایا وہ بہت خوش ہوئے، میں کوئی ضروری بات کہنے ہی والی تھی، کہ میں نے دیکھا بختاور چلا آ رہا ہے، مجھے بے حد غصہ آیا اس کا یہاں کیا کام، تربیت گاہ میں لڑکیاں پردہ نہیں کرتی تھیں، لیکن میں اسے بھی پسند نہیں کرتی تھی کہ مردوں کے آنے جانے کا سلسلہ قائم رہے، بختاور بڑی بے تکلفی سے سیٹھ صاحب کے پاس بیٹھ گیا، اور للچائی ہوئی نظروں سے ماہرو کو دیکھنے لگا اب مجھے اور غصہ آیا، میں نے ماہرو سے اشارہ کیا، وہ چلی گئی، اس کے جانے کے بعد میں نے بختاور سے کہا:

"تم یہاں کیوں آئے؟"

"آ گیا —— تو... ؟"

تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ، اب کبھی یہاں قدم بھی نہ رکھنا۔

آہاہ! کبھی یہاں قدم بھی نہ رکھنا، کیوں نہ رکھوں قدم؟ میں تو بار بار آؤنگا دیکھوں گا کون (گالی دے کر) مجھے روکتا ہے؟"

"تم بہت گستاخ ہو، میں تمہیں گھر میں بھی نہیں گھسنے دوں گی۔"

"اچھا! گھسنے دیتا ابھی تو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔"

یہ کہہ کر جیب سے سگریٹ نکال کر پینے لگا، میں غصّہ کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی، سیٹھ صاحب چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے، جیسے کسی شوہر کی چہیتی اور لاڈلی بیویاں آپس میں جھگڑ رہی ہوں اور وہ غیر جانبداری کے ساتھ لڑائی کا تماشہ دیکھ رہا ہو۔

میں نے سیٹھ صاحب سے کہا:۔

"سنیں آپ نے اس کی باتیں؟"

"سُن لیں ــــ لیکن وہ آگیا تو کیا غضب ہوگیا، تم بھی تو خواہ مخواہ مُجھ پڑیں۔"

سیٹھ صاحب سے مجھے اس جواب کی ہرگز توقع نہیں تھی، میں نے اپنے تئیں سنبھال کر کہا:۔

"آخر عورتوں اور لڑکیوں کے بیچ میں ایک غیر مردوئے کا کیا کام ہے؟"

سیٹھ صاحب نے قدرے برہمی کے ساتھ کہا:

"غیر تو میں بھی ہوں، میں جو آتا ہوں، اب تم میرے داخلہ پر بھی پابندی عائد کر دو۔"

میں نے کہا:۔

"آپ کی بات دوسری ہے، لیکن یہ نہیں آسکتا اسے منع کیجئے۔"

سیٹھ صاحب کا غصّہ قابو سے باہر ہو چکا تھا، کڑک کر انھوں نے کہا

"کوئی نہیں منع کر سکتا، اسے ضرور آئے گا یہ یہاں!"

خیریت یہ ہوئی کہ پرنسپل صاحبہ اس وقت یہاں نہیں تھیں۔ میں سوچنے لگی۔ اگر وہ یہاں ہوتیں۔ اور اس طرح سیٹھ صاحب مجھے ان کے سامنے ڈانٹتے۔ تو میری کیا رہ جاتی؟ ان کے سامنے اگر بختاور اس طرح مجھ سے پیش آتا۔ تو کیا منہ میں انہیں دکھاتی۔

میں جانے کے لئے اٹھی اور جاتے جاتے میں نے کہا۔

"تو میں جاتی ہوں یہاں سے۔ اور یہ اگر آتا رہا۔ تو بند کر دوں گی اس تربیت گاہ کو۔"

سیٹھ صاحب بھڑک کر بولے۔

"تم جاتی تو ہو جاؤ۔ لیکن تربیت گاہ تم نہیں بند کر سکتیں۔ وہ میرے روپے سے چل رہی ہے۔ میں چلاؤں گا اُسے!"

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں سیٹھ صاحب کا منہ نوچ لوں۔ لیکن ضبط کر گئی؛ بختاور مسکرا رہا تھا۔ سیٹھ صاحب اور بختاور وہیں بیٹھے رہے میں چلی آئی۔

سیٹھ صاحب کی کوئی بات مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ تو میں رونے لگتی تھی۔ اس وقت مجھے رونا بھی نہیں آرہا تھا۔ میرے آنسوؤں کا دریا سوکھ گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی۔ یہ ایک دم کیا ہوگیا؟ اب تک سیٹھ صاحب کیا تھے۔ اور آج کیا بن گئے۔ میں اب اس حالت کو پہنچ گئی کہ ایک ایک معمولی نوکر کے سامنے مجھے جھڑک دیا جائے۔ ذلیل کیا جائے، اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ اس بے حیائی سے تو فقر و فاقہ

کی زندگی بہتر ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ میں نے سیٹھ صاحب پر احسان کیا ہے کہ ان کی رفیق زندگی بن گئی۔ آج معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب ایک لونڈی سے بھی ذلیل اور بدتر سمجھتے ہیں۔ یہ ان کا احسان ہے کہ میں ان کے در پڑی ہوں۔ اور مجھے کھانے کو دو روٹیاں مل جاتی ہیں۔

میں اسی خیال میں بیٹھی تھی۔ کہ کرشنا کماری آئیں۔ یہ کالج کی پرنسپل تھیں۔ عمر کوئی پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ بڑی شریف عورت تھیں بہت جلد ہم دونوں میں دوستی ہوگئی۔ میں بہت مانتی تھی انھیں وہ بھی کچھ بگڑی بگڑی سی تھیں۔ آتے ہی کہنے لگیں۔

"مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں ہیں!"

میں نے کہا۔

"کون سی باتیں؟"

انھوں نے ماتھے پر شکن ڈال کر کہا۔

"میں اس تربیت گاہ کو تفریح گاہ نہیں بنانا چاہتی۔ میرا استعفیٰ قبول کیجئے۔"

میں بہت حیران ہوئی، میں نے کہا۔

"آخر کیا ہوا کیا، کچھ کہئے تو!"

کہنے لگیں۔

"سیٹھ صاحب ماہرو اور پروین کو سینما کیوں لے گئے؟"

یہ سُن کر مجھے بڑی لاج آئی جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں

سما جاؤں۔ میں نے بات بنائی

"تو کیا ہوا، وہ تو اپنی اولاد کی طرح طالبات کو چاہتے ہیں۔ لے گئے ہوں گے کہ بے چاریوں کا ذرا جی بہل جائے۔ اوبھ گئی ہوں گی، تربیت گاہ کی خشک فضا میں رہتے رہتے۔ آخر وہ بھی تو ہماری آپ کی طرح آدمی ہیں۔"

میری یہ بات کرشنا کماری کے جی کو نہیں لگی۔ انھوں نے کہا

"میں نہیں مانتی یا تو اس تربیت گاہ کے مقصد کو میں غلط سمجھی ہوں یا آپ غلط سمجھی ہیں میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ تربیت گاہ اس قسم کے دوسرے اداروں کے مقابلے میں جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، تفریح، دل بہلاؤ لطف زندگی، یہ چیزیں ان لوگوں کو راس آتی ہیں۔ جو زندگی کا لطف اُٹھانا چاہتے ہوں۔ ایک بیوہ کو جب تک وہ بیوہ ہے، لطف و تفریح سے کیا کام؟ اور بیوہ بھی وہ جو ہمیشہ بیوہ رہنا چاہتی ہے۔ جس کا مقصد زندگی یہ ہے کہ اپنے سہاگ کو، اپنی زندگی کو، اپنی خوشی کو قوم پر قربان کردے ——————— یہ سمجھئے گا کہ میں عقد بیوگان کی مخالف ہوں، ہرگز نہیں، میں تو یہ چاہتی ہوں کہ بیوائیں بھی زندگی کا لطف اٹھائیں۔ خانگی زندگی بسر کریں۔ اور گھر کا سکھ حاصل کریں۔ لیکن جس طرح مردوں میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو زندگی بھر شادی کے جنجال میں نہیں پھنستے۔ اور اپنا سارا وقت قوم کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر خود اپنی مرضی سے کچھ عورتیں یہ عہد کرتی ہیں کہ وہ اب شادی نہیں

کریں گی۔ اور سارا وقت قوم کی خدمت میں صرف کریں گی۔ تو انھیں اپنے اس عہد کو نبھانا چاہئے۔ اور اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ لذتِ نفس کا خیال بھی ان کے دل میں نہ آنے پائے۔"

کرشنا کی باتیں میرے دل میں اترتی چلی جا رہی تھیں۔ بلکہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ میرے دل کی بات تھی۔ خود میرا خیال بھی یہی تھا لیکن یہاں معاملہ آن پڑا سیٹھ صاحب کا۔ اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ ان کی سُبکی ہو۔ وہ دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہوں۔ میں نے پھر بات بنانے کی کوشش کی۔

"بہن! تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میرا خیال بھی یہی ہے۔ اور اسی خیال کے پیش نظر میں نے یہ تربیت گاہ قائم کی ہے۔ لیکن میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ سیٹھ صاحب ہماری تربیت گاہ کی طالبات کو اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔ باپ کا دل اولاد کے حال زار پر کڑھتا ہی رہتا ہے۔ وہ ہر طرح سے انھیں خوش رکھنا چاہتا ہے، مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ انھیں خود سینما کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ کبھی کبھار چلے جاتے ہیں۔ آج جانے لگے تو ان کے جی میں آئی ہوگی۔ لڑکیوں کو بھی دکھادیں تماشہ۔ وہ آئیں گے تو میں انھیں سمجھا دوں گی۔ اور تم بھی ذرا سہولت سے پروین اور ماہرو کو سمجھا دینا۔ اور کہہ دینا کہ ایک دفعہ پھر اپنے دل کو ٹٹول لیں۔ اگر ہمارے مقاصد سے اتفاق ہو تو رہیں اس تربیت گاہ میں۔ ورنہ میں خود اس پر تیار ہوں کہ اپنے صرف سے ان کی شادی کسی اچھی جگہ کرادوں۔"

"میں نے مان لیا، میں سمجھا بھی دوں گی، ان دونوں کو۔ لیکن میں پوچھتی ہوں، اگر سیٹھ صاحب باپ کی طرح لڑکیوں کو چاہتے ہیں۔ تو صرف ماہرو اور پروین ہی کو کیوں لے گئے؟ سب لڑکیوں کو کیوں نہیں لے گئے کچھ کنگال تو ہیں نہیں کہ دیوالہ نکل جاتا۔ وہ چاہتے تو سارے شہر کو اپنی جیب سے سینما دکھا سکتے ہیں۔ کہو کچھ جھوٹ کہہ رہی ہوں میں!"

میں ہنس پڑی، میں نے کہا

"نہیں جھوٹ تو نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھ گئی۔ تم اس لئے جل رہی ہو کہ سیٹھ صاحب تمہیں نہیں لے گئے اپنے ساتھ!"

کرشنا کماری کا غصہ کچھ کم ہو چلا تھا۔ وہ مسکرا دیں کہنے لگیں۔

"چلو ہٹو بھی میں کیوں جلتی؟ میں خود جب چاہوں جا سکتی ہوں۔"

میں نے بات پکڑلی۔

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ تم جب چاہو جا سکتی ہو۔ اس لئے سیٹھ صاحب تمہیں نہیں لے گئے۔ اور وہ بے چاریاں کبھی چاہیں تو بھی نہیں جا سکتیں۔ اس لئے سیٹھ صاحب کا دل کڑھا۔ اور وہ انھیں اپنے ساتھ لے گئے اتنی سی بات تھی اور تم بگڑ بیٹھیں ——— یہ بھی کوئی بات ہوئی؟"

"بات کیسے نہیں ہوئی، اچھا مان لیا سیٹھ صاحب کا دل باپ کا دل ہے، اور وہ اپنے ساتھ لے گئے ان لڑکیوں کو۔ لیکن یہ تو بتاؤ یہ مُئے بجّا ور کو ان کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت تھی۔ نابھی۔ یہ باتیں ہیں

تھی اسے!"

"اے سچ بڑا بدمعاش ہے موا"

"ہوگا، تم سچ کہہ رہی ہو ——— لیکن مجھے، یہ آج معلوم ہوا کہ وہ آتا رہتا ہے، بہتر یہ ہے کہ تم اس کا داخلہ بند کردو، اب اگر وہ کبھی آئے تو صاف صاف کہدو اس سے یہاں مردوں کا کام نہیں ہے!"

ایک دفعہ میں نے یہی بات بڑی سہولت سے کہی تو تھی لیکن وہ زبان لڑانے لگا؟"

"کیا کہا تھا تم نے؟"

"میں نے کہا۔ میاں یہ لڑکیوں کی جگہ ہے، یہاں مردوں کا کیا کام؟"

دیدے مٹکا کر کہنے لگا۔

"مرد نہ آئیں گے تو کام کیسے چلے گا؟"

میں اس کے منہ کیا لگتی چپ رہی۔

اچھی نہیں لگتیں۔"

میں اپنی حیرت نہ ضبط کرسکی، میں نے کہا۔

"کیا کہا نجتاور بھی گیا ہے اُن کے ساتھ؟"

"یہ لو کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ میں کیوں جھوٹ بولنے لگی۔ پوچھ لو جس سے تمہارا جی چاہے!"

نجتاور کا ذکر سن کر میرا ماتھا ٹھنکا، مجھے شبہ ہوا کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ مدتیں ہوگئیں سیٹھ صاحب مجھے لے کر بھی سینما نہیں گئے آج انھیں کیا سوجھی کہ پروین اور ماہرو کو بھی لے گئے، اور ان کے ساتھ نجتاور کو بھی،

میں نے کرشنا سے کہا۔

"یہ بہت بُرا ہوا، آنے دو سیٹھ صاحب کو۔ دیکھنا کیسا دھرنا کہ میں ان سے لڑتی ہوں۔ اس موئے نجتاور سے تو میں خصوصیت سے جلتی ہوں!"

میں تو تمہارا لحاظ کرتی تھی۔ ورنہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں تربیت گاہ کے احاطہ میں اس کا داخلہ بند کردوں مجھے تو بڑا بدمعاش دکھتا ہے وہ، جب دیکھو بہانے ڈھونڈ کر آیا کرتا ہے، اور لڑکیوں کو گھورا کرتا ہے ——— یہ ہے کون سیٹھ صاحب کا؟

میں نے کہا۔

"پرائیویٹ سکریٹری ہے ان کا، چال چلن کا اتنا برا تو نہیں سمجھتی!

باب ۲۳
ڈاکہ

رات کو دس بجے کے قریب سیٹھ صاحب واپس آئے، بختاور ان کے ساتھ تھا، دونوں بہت خوش تھے، ہنستے ہوئے کار پر سے اترے یا تو بختاور سیٹھ صاحب سے کھنچا رہتا تھا۔ یا آج وہ سیٹھ صاحب کی بلائیں لے رہا تھا، بے انتہا خوش تھا۔ اس کی خوشی دیکھکر سیٹھ صاحب بھی جامے میں نہیں سما رہے تھے،

میں تلی بیٹھی تھی کہ آج جو کچھ ہو جائے، مگر سیٹھ صاحب سے فیصلہ کرکے رہوں گی۔ یا میں نہیں یا بختاور نہیں۔ وہ جیسے ہی آئے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انھوں نے مجھے دیکھا۔ لیکن چپ بیٹھے رہے کچھ بولے نہیں، میں نے کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں!"

بے پروائی سے جواب دیا۔ "اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے!"

میں نے ترشروئی کے ساتھ کہا۔

"مجھے اسی وقت گفتگو کرنی ہے، آپ کو اسی وقت سننا ہے۔ ہمیں اسی وقت فیصلہ کرنا ہے۔"

اس لب ولہجہ سے پہلی مرتبہ میں نے سیٹھ صاحب سے گفتگو کی تھی، ان کے کان کھڑے ہوئے آہستگی سے بولے،

"کہو!"

"آپ کہاں گئے تھے؟"

"تمہیں کیا؟"

"مجھے یہ پوچھنے کا حق ہے، اور اس کا جواب دینا آپ کا فرض ہے، میں آپ کی بیوی ہوں، لونڈی نہیں ہوں، اور بیوی بھی وہ جسے آپ بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائے تھے۔ لیکن جسے ماں، بہن کی طرح آپ نے رکھا۔ جو ہمیشہ آپ کی کمزوریوں پر پردہ ڈالتی رہی۔"

بڑے ٹھنڈے لہجے میں سیٹھ صاحب نے جواب دیا۔

"سینما گیا تھا!"

"اور آپ کے ساتھ کون گیا تھا!"

"بختاور"

"اور؟"

"ماہرو!"

"اور؟"

"پردیں!"

"آپ نے پرنسپل سے اجازت لی تھی!"

"نہیں!"

"مجھ سے پوچھا تھا؟"

"نہیں!"

"کس حق سے ان لڑکیوں کو لے گئے تھے آپ؟ نجتا ور کیوں گیا تھا آپ کے ساتھ کیا اس تربیت گاہ کو چکلہ بنا دینا چاہتے ہیں، یاد رکھئے میں ایسا نہیں ہونے دوں گی ——— کبھی نہیں ہونے دوں گی"

"تم بہت بڑھ رہی ہو شیریں!"

میں واقعی شیر کی طرح گرج رہی تھی، میں نے کہا۔

"میں بڑھ رہی ہوں۔ لیکن انسانیت اور شرافت پر داغ نہیں لگا رہی ہوں، میں جوان ہوں، لیکن اپنے قابو میں ہوں، آپ بوڑھے ہیں، لیکن بدمست ہیں۔ آپ کو اپنی زندگی پر اختیار تھا، میری زندگی پر آپ کو اختیار تھا۔ لیکن تربیت گاہ کی معصوم اور انجان لڑکیوں کو آپ تباہ نہیں کر سکتے، میں آپ کا گلا گھونٹ دوں گی:۔ ساری دنیا میں بدنام کر دوں گی، آپ کو تربیت گاہ سے ہاتھ اٹھانا پڑے گا، آپ کا داخلہ تربیت گاہ میں بند کیا جاتا ہے! اب آپ نے کبھی اس کے احاطہ میں قدم رکھا۔ تو نہایت ذلت سے آپ کو واپس آنا پڑے گا اور نجتا ور آج سے اس گھر میں کبھی قدم

نہیں رکھ سکے گا!"

سیٹھ صاحب غصہ میں بگڑ کر بولے۔

"میں اب زیادہ نہیں سن سکتا۔ میں حکم دیتا ہوں کہ آج سے تم تربیت گاہ میں قدم نہ رکھنا۔ ورنہ بہت ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالی جاؤ گی اب تم اس گھر میں بھی نہیں رہ سکتیں، صبح ہوتے ہی اپنا بوریہ بستر اٹھاؤ، اور سدھار جاؤ اپنے ماں باپ کے یہاں، میرے گھر کا دروازہ آج سے تمہارے لئے، تمہارے ماں باپ کے لئے تمہاری بہنوں کے لئے بند ہے۔ میں یہ گستاخی برداشت نہیں کر سکتا، تم اپنی حیثیت بھول رہی ہو ——— !"

یہ کہہ کر سیٹھ صاحب جانے کے لئے اٹھے، میں نے ان کا دامن پکڑ لیا، اور کہا۔

"آپ ابھی نہیں جا سکتے!"

دامن جھٹک کر

"چھوڑ دو مجھے!"

"نہیں چھوڑوں گی"

"میں کوئی بات نہیں سننا چاہتا تمہاری"

"آپ کو ہر بات سننی پڑے گی میری،

"تم گستاخ ہو!"

"آپ بدمعاش ہیں ——— گستاخی گوارا کی جا سکتی ہے"

بدمعاشی گوارا نہیں کی جا سکتی۔"

یہ سُن کر سیٹھ صاحب کا غصہ انتہا کو پہونچ گیا۔ اُنھوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

"کیا کہا؟"

"آپ سُن چکے ہیں۔ جو کچھ میں نے کہا۔ اگر آپ رسوائی سے بچنا چاہتے ہیں۔ تو وہی کیجئے جو میں کہہ رہی تھی۔ ورنہ نتائج نہایت تلخ ہوں گے، مجھے اب آپ سے نفرت ہوتی جا رہی ہے، پھر بھی میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ ذلیل و رسوا ہوں، پھر غور کر لیجئے ایک بار!"

کچھ دیر بعد بنجتا ور بھی آ گیا تھا، وہ چپ بیٹھا ہماری باتیں سُن رہا تھا۔ اب وہ سیٹھ صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔

"کہو تو کردوں ٹھیک اس چھوکری (میری طرف اشارہ کرکے) کو ابھی!"

میں نے اُس سے کہا

"میں سیٹھ صاحب نہیں ہوں، انھی کو ٹھیک کر مجھے کیا ٹھیک کرے گا تو!"

وہ اس وقت شاید پیئے ہوئے تھا، جھوم کر اٹھا اور میری طرف بڑھا۔

میں بھی اس وقت ہوش میں نہیں تھی۔ ایسا غصہ مجھے زندگی بھر نہیں آیا تھا۔ اس وقت میرے اندر ایسا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ جب

سوچتی ہوں، مجھے خود حیرت ہوتی ہے۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھکر میں پیچھے ہٹی وہ اور آگے بڑھا، اس نے میرے سر کے بالوں پر ہاتھ بڑھایا شاید وہ انہیں پکڑ کر مجھے پٹخنا چاہتا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی ران پر ایک لات زور سے ماری، وہ لڑکھڑایا، میں نے اس کے سینے پر ایک مکہ پوری طاقت سے مارا، نشہ میں بے خود تو ہو ہی رہا تھا، ڈگمگانے لگا، مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ایک دھکا اور دیا۔ وہ سیٹھ صاحب کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا دھڑام سے زمین پر گرا، سیٹھ صاحب بھی اس کے ساتھ ساتھ زمین پر آ رہے۔

وہ پھر اُٹھنے والا تھا کہ سیٹھ صاحب نے اسے روکا، اب سیٹھ صاحب نہ معلوم کس ارادہ سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ کرشنا کماری آتی ہوئی دکھائی دیں۔ انھیں دیکھ کر سیٹھ صاحب سنبھل گئے اور بنجتا ور بھی چپ ہو گیا۔

کرشنا کماری نے ہم لوگوں کی لڑائی کا تماشہ تو نہیں دیکھا تھا لیکن کمرہ پر ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور ہم لوگ اس طرح منہ پھلائے ہوئے تھے کہ وہ سمجھ گئیں کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ پہلے تو وہ کچھ جھجکیں سیٹھ صاحب نے ان سے پوچھا

"کیسے آنا ہوا آپ کا اس وقت!"

وہ آگے بڑھیں اور کہنے لگیں، میں پولیس کو اطلاع دینے جا رہی ہوں آپ کے اور بنجتا ور کے کرتوتوں کی۔ پھر میری طرف مخاطب

ہوئیں۔ بہن معاف کرنا میری غلطیوں کو، اب میں یہاں نہیں رہ سکتی
یہی کہنے آئی تھی۔ یہاں سے میں پولیس اسٹیشن جاتی ہوں۔ وہاں سے
کہیں اور چلی جاؤں گی۔ اس گھر کا اب رخ بھی نہیں کروں گی۔
پولیس کا نام سن کر نجنا ور کا منہ ایک دم سفید ہو گیا، سیٹھ صاحب
کا بھی منہ بھی زرد ہو گیا۔ اور میں بھی حیران ہو گئی، میں نے ان سے کہا۔
"پولیس کیوں جا رہی ہو کیا بات ہے؟"
"جو کچھ ہو چکا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے ——؟
یہ لچھن ہیں ہمارے بڑے آدمیوں کے۔ زمین نہیں پھٹ جاتی آسمان
بھی نہیں ٹوٹ پڑتا!"
میں کرشنا کماری کے قریب آگئی، میں نے کہا۔
"کچھ بتاؤ تو کیا ہوا؟ اگر تمہیں کوئی شکایت ہے۔ تو مجھ سے کہو، سیٹھ
صاحب سے کہو، ہم اس کا تدارک کر دیں گے، پولیس میں جانے سے کیا
حاصل؟ کیا چوری ہو گئی ہے؟"
کرشنا کماری رونے لگیں، انھوں نے بلند آواز سے کہا۔
"چوری نہیں ہوئی، ڈاکہ پڑا ہے —————— مال پر نہیں
—————— آبرو پر، ایک شریف، بھولی، کم سن اور پاکباز لڑکی کی
عصمت پر دن دھاڑے —————— تم تو کہہ رہی تھیں کہ سیٹھ صاحب
تربیت گاہ کی لڑکیوں کو باپ کی طرح چاہتے ہیں۔
میں نے کہا

"ہاں تو؟"
"کیا کوئی باپ اپنی لڑکی کی آبرو پر، سنڈے مسٹنڈے نوکروں
سے ڈاکہ ڈلواتا ہے؟ —————— ہائے رام یہ اندھیر!"
یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں،
میں سمجھ گئی معاملہ بہت اہم ہے، سیٹھ صاحب سے میں نے کہا
"آپ اوپر جائیے، اور کرشنا کو میں اپنے کمرے میں لے گئی۔

باب ۲۴
ماہرو کی سرگذشت

کمرے میں پہنچ کر میں نے کرشنا کو صوفے پر بٹھایا، اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اب تک روئے چلی جا رہی تھی، میں نے اس کے آنسو پونچھے اور دلدہی کے لہجے میں کہا۔

"کیوں رو رہی ہو کیا بات ہوئی۔ پورا واقعہ تو بیان کرو۔"

کرشنا کا گریہ گلوگیر ہو رہا تھا، وہ بات کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی، بڑی مشکلوں سے اس نے اپنے تئیں سنبھالا، کہنے لگی۔

"کہہ تو چکی میں سب کچھ، اب کیا پوچھ رہی ہو، میں کیا بتاؤں؟"

یہ کہہ کر پھر اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے،

میں نے کہا

"مجھے ہول دل ہو رہا ہے، میں پورا واقعہ سننا چاہتی ہوں۔"

"مجھے تو جو کچھ معلوم تھا، بتا دیا، تفصیل مجھے بھی نہیں معلوم، چلو خود پوچھ لو ماہرو سے!"

"چلو وہیں چلیں"

یہ کہہ کر میں کرشنا کے ساتھ ماہرو کے کمرے میں گئی۔ وہ تکیہ سے منہ چھپائے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی، میں نے بڑے پیار سے اسے اٹھایا، چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا، آنکھیں سوج کر کپا ہو گئی تھیں، اس نے کرشنا کو دیکھا۔ پھر ایک حسرت کی نگاہ مجھ پر ڈالی، اور بے ساختہ رونے لگی منہ ڈھانپ کر،

میں نے کہا

"ماہرو میں کرشنا بہن سے سب کچھ سُن چکی ہوں لیکن میں تمہاری زبان سے تفصیل سننا چاہتی ہوں، بڑا پاپ ہوا ہے، اور اگر میری جان میں جان باقی ہے۔ تو اس پاپ کا بدلہ لے کر رہوں گی، لیکن میری ماہرو بتا تو دے سارا ماجرا"

اب وہ سنبھل چکی تھی، کہنے لگی۔

"آپ کے جانے کے بعد سیٹھ صاحب نے مجھے بلایا۔ پروین ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سر جھکا کر انہیں سلام کیا۔ اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ پروین مسکرائے جا رہی تھی، بختاور کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھیل رہا تھا، سیٹھ صاحب نے مجھ سے کہا

"چلو ماہرو تمہیں سینما دکھا لائیں۔"

میں نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی؟"

حیرت سے منہ کھول کر بولے۔

"کیوں؟ ہم لے جائیں گے تب بھی نہیں جاؤ گی؟"

میں نے ادب کے ساتھ کہا۔

"تب بھی نہیں، میں ہنسی اور تفریح کی دنیا میں واپس نہیں جانا چاہتی!"

بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے۔

"جب تک زندہ ہو، زندگی سے ناطہ نہیں توڑ سکتیں، تربیت گاہ میں رہنے کے معنے یہ ہیں کہ تم سب کچھ سیکھ لو، اور خدمت کا چلن اختیار کرو، یہ نہیں کہ بڑھاپا طاری کرو، اور ہر دلچسپ چیز سے منہ موڑ لو یہ نہیں ہو سکتا کہ تم میری بیٹی ہو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا، یہ پروین بھی تو جا رہی ہے!"

میں ابھی کچھ جواب نہیں دینے پائی تھی۔ کہ پروین سے سیٹھ صاحب نے کہا،

"بھئی یہ ماہرو تو بڑی مردہ دل ہے!"

وہ ہنسنے لگی، کہنے لگی:-

"ہاں ——— پگلی ہے اچھی خاصی!"

پھر میری طرف مخاطب ہوئی۔

"چلو نا، آ جائیں گے تھوڑی دیر میں۔ کچھ روز روز تھوڑے ہی جاتے ہیں!"

سیٹھ صاحب کا لحاظ میں بہت کرتی تھی، خاموش ہو گئی، پروین کو میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ اٹھے میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگے۔

"چلنا پڑے گا تجھے میرے ساتھ" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل آئے میں اور سیٹھ صاحب آگے آگے تھے، پروین اور بختاور پیچھے پیچھے، باہر آکر ہم لوگ کار میں بیٹھ گئے، پروین بختاور کے پاس بیٹھی وہی ڈرائیو کر رہا تھا اور میں پچھلی نشست پر سیٹھ صاحب کے پاس بیٹھ گئی۔

موٹر چلتی رہی اور میں نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی، مجھے اپنا پچھلا زمانہ یاد آ رہا تھا، وہ زمانہ جو راحت اور آرام، پریم اور محبت کا زمانہ تھا، تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ایک بڑے باغ کے اندر پہونچی، پھر ایک خوشنما کوٹھی کے سامنے جا کر رکی، ہم لوگ اتر پڑے، کوٹھی بالکل خالی تھی۔ بالائی منزل پر ہم لوگ پہونچے وہاں بھی سناٹا تھا، سیٹھ صاحب بختاور کو لے کر سامنے کے بغلی کمرے میں چلے گئے، میں اور پروین بیٹھے رہ گئے میں نے پروین سے کہا۔

"اچھا سینما ہے یہ، کہاں لے آئے یہ ہم لوگوں کو؟"

وہ مسکرائی، اس نے کہا۔

"گھبرا گئیں۔ یہی ہوا نہیں سینما ہوگا، بڑے مزے کا پیج!"

میں نے کہا۔

"میرا جی گھبرا رہا ہے!"

اس نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"یہاں تو کھلونے بھی نہیں ہیں کہ میری ننھی امی سے کھیل کھیل کر ننھا سا جی بہلا لیتی!"

"بڑی شریر ہو تم"

"اور تم بڑی بھولی ہو!"

"سچ سچ بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے؟"

"گھبرا کیوں رہی ہے ری، معاملہ کیا ہوتا، جی بہلانے آئے ہیں یہاں کچھ دیر ہنسیں بولیں گے، پھر سینما بھی دیکھ آئیں گے جا کر"

"بڑا دیدہ ہو گیا ہے تیرا، ذرا بھی نہیں گھبرا رہی ہے!"

"گھبراؤں کیوں؟ کوئی مجھے کھا تھوڑے جائے گا"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نجما اور آیا عجب نشہ سا چھایا ہوا تھا اس وقت، اس نے مخمور نگاہوں سے پروین کو دیکھا۔ پروین اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں نے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا۔ اور اسی کمرہ میں چلے گئے۔ میں اکیلی بیٹھی رہ گئی، اب میں اور حیران ہوئی نجمہ اور کی اس وقت کیا حالت تھی۔ پروین بے جھجک اس کے ساتھ کیوں چلی گئی؟

بڑی دیر تک میں اسی کش مکش میں بیٹھی ہوئی نہ جانے کیا کیا

سوچتی رہی کہ پروین آئی اس وقت اس کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا، وہ خوش تھی، بے اندازہ خوش، جیسے اسے کوئی بہت بڑی چیز بن مانگے مل گئی ہو، وہ اٹھلاتی ہوئی آئی اور میرے پاس بیٹھ گئی، میں نے کہا۔

"کہاں رہیں اتنی دیر؟ کیا کر رہی تھیں، میں تو اکیلی بیٹھے بیٹھے اوبھ گئی بھئی!"

اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں کہنے لگی۔

"تم تو پاگل ہو اچھی خاصی، اوبھنے کی کیا بات تھی——؟ چلو میرے ساتھ!"

"کہاں چلوں؟"

"جہاں میں گئی تھی اور کہاں؟"

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور گھسیٹتی ہوئی مجھے اسی کمرے میں لے گئی، بڑا شاندار کمرہ تھا اور خوب سجا ہوا تھا، مجھ سے کہنے لگی۔

"تم بیٹھو میں ابھی آئی!"

میں ذرا بگڑ کر بولی

"اے واہ کہاں جا رہی ہو تم میں نہیں بیٹھتی!"

اس نے ہلکے سے میرے گال پر ایک چپت لگائی، کہنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ نا میں ابھی آتی ہوں، ایسا بھی کیا گھبرانا، ابھی آئی

"کیوں گھبراتی ہو مجھ سے؟"

"یہ بات نہیں ہے، بات یہ ہے کہ اکیلے میں میرا آپ کا بیٹھنا مناسب نہیں ہے!"

وہ ٹھٹھہ مار کر ہنسا، کہنے لگا۔

"چھوڑو ان باتوں کو ——— جوانی اگر جوانی کے پاس نہیں بیٹھے گی، تو کہاں جائے گی بیٹھے گی!"

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوری طاقت سے اٹھایا' میں کھڑی ہوگئی، اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھک کر مجھے گود میں اٹھا لیا۔ اور اسی کمرے میں چلا گیا، جہاں سے آیا تھا۔ میں اس کے ہاتھوں میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی، ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ کمرے میں جاکر اس نے مجھے ایک صوفے پر پٹک دیا۔ دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ پکڑ لئے اور میرے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔ میں نے لاکھ ہلنے کی اور چھڑانے کی کوشش کی، لیکن کہاں وہ اور کہاں میں!

میں نے چیخنا چاہا، لیکن میرا گلا خشک ہو رہا تھا' میرے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا' میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی' میں نے بڑی لجاجت اور منت سے کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم ——— میں بیوہ ہوں' بدمعاش نہیں ہوں۔ رحم کرو مجھ پر"

جاتی ہوں میں ——— شاباش!"

یہ کہہ کر بغیر میرا جواب سنے، وہ سَن سے کمرہ سے نکل گئی۔ اور باہر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں سمجھی مذاق کر رہی ہے۔ ہمیشہ سے عادت ہے اس کی مذاق کرنے کی، میں چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

چار پانچ منٹ کے بعد دیکھتی کیا ہوں، ملے ہوئے کمرے کا ایک دروازہ کھلا اور نجتاور نمودار ہوا، اسے دیکھ کر میں گھبرا گئی۔ لیکن چپ چاپ اپنی کرسی پر بیٹھی رہی، اس نے مجھ سے پوچھا۔

"پرویں کہاں گئی؟"

"کہیں گئی ہے۔ کہہ گئی ہے ابھی آتی ہوں۔"

"دروازہ بھی وہی باہر سے بند کر گئی ہے!"

"ہاں!"

وہ میرے قریب آکر بیٹھ گیا، اس نے کہا۔

"بڑی شریر ہے پرویں!"

"بہت!"

"تم اتنی ہی بھولی ہو!"

مجھے نجتاور کی یہ باتیں بہت بری لگیں۔ پرویں پر بھی مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ میں نے کہا۔

"آپ جس کمرے سے آئے ہیں وہیں چلے جائیے۔ یا آپ یہاں بیٹھئے میں وہاں چلی جاؤں۔"

میں اکیلا نجتاور نہیں ہوں۔ اور تم اکیلی ماہرو نہیں ہو، ماہرو اور نجتاور کا کھیل اس دنیا میں ہر روز نہ جانے کتنی بار کھیلا جاتا ہے۔ نجتاور کا آقا کچھ کر پاتا ہے، نہ ماہرو کی پرنسپل، نہ نجتاور اپنی بہن کو بچا سکتا ہے، نہ ماہرو اپنی عصمت کو ——— یہ کہہ کر وہ بڑی زور سے ہنسا ——— اور ——— اور ——— میری کچھ نہ چلی، میں کچھ نہ کر سکی، وہ جیت گیا، میں ہار گئی۔"

ماہرو پھر رونے لگی، لیکن خود ہی اس نے اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگی۔

"وہ مجھے نڈھال کر کے مسکراتا ہوا اٹھا کہنے لگا۔ اب میں نیچے جاتا ہوں، اب پرویں آتی ہوگی، چاہو اسے اپنا رازدار بنا لو، چاہے روتی رہو۔ لیکن ٹسوے بہانے سے جو کچھ چھن چکا وہ مل نہیں سکتا، سمجھ سے کام لوگی۔ اتنی ہی مگن رہوگی، جتنی پرویں ہے۔ کتنی سمجھدار لڑکی ہے وہ، ذرا بھی مجھے اس سے بحث نہیں کرنی پڑی۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے پیام دیا، اور اس نے آنکھوں آنکھوں میں اسے قبول کر لیا، اس دن سے وہ جانتی بھی نہ نہیں انکار کے کہتے ہیں، ہم دونوں مزے کر رہے ہیں۔

دنیا میں اسی طرح رہتے ہیں، اسی طرح رہنا چاہیئے۔

یہ کہہ کر وہ نیچے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پرویں آئی، آتے ہی بڑے چاؤ سے میرے پاس آکر بیٹھ گئی، میں رو رہی

اس نے اسی طرح جکڑے جکڑے مجھے جواب دیا۔

"بیوہ پرویں بھی ہے، بدمعاش وہ بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ بھی جوان ہے، تم بھی جوان ہو، اس کے سینے میں بھی دل ہے، اور تمہارے سینے میں بھی دل ہے۔ دل جوانی میں جو کچھ مانگتا ہے۔ وہی میرے پاس ہے، وہی میں پرویں کو بھی دیتا رہتا ہوں۔ اور آج تمہیں بھی دے کر رہوں گا۔

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے مستی کے شعلے نکلنے لگے، اس کا سانس اور گرم ہوگیا۔ اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی، میں نے کہا

"میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی!"

اکڑ کر کہنے لگا۔

"وہی منہ جو دنیا تمہیں دکھاتی ہے۔ جب وہ اپنا منہ دکھاتے ہوئے تمہیں نہیں شرماتی، تو تم اپنا منہ اسے دکھاتے ہوئے کیوں شرماؤ!"

وہ یہ باتیں کر رہا تھا۔ اور اس کے بازوؤں کا شکنجہ اور زیادہ کستا جا رہا تھا۔ میں اتنی بھینچ چکی تھی کہ سانس کا آنا جانا مشکل ہو رہا تھا میں نے اس سے روتے روتے کہا۔

"تمہاری کوئی بہن نہیں ہے؟"

"نہیں ہے اور اگر ہوئی بھی تو!"

"اس کے لئے تم یہ پسند کرتے؟"

"میرے پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے، یہ تو دنیا ہے، یہاں

ڈالوں گی، ہم دونوں ساتھ ساتھ کھینچیں گے اسے اور ختم ہو جائیں گے ——— کہو تیار ہو؟"

میں ابھی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ سیٹھ صاحب تشریف لائے اور ان کے ساتھ ساتھ بختاور بھی!

آتے ہی سیٹھ صاحب نے پرویں سے کہا

"بہت دیر ہوگئی اب چلو!"

"اور سینما؟"

"ہاں ——— سینما تو رہ ہی گیا، پھر کسی دن سہی!"

یہ کہکر وہ مسکرانے لگے۔ بختاور نے پرویں کو دیکھا اور پرویں نے بختاور کو، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھکر ہلکے سے تبسم کے ساتھ آنکھیں نیچی کرلیں۔

یہاں جب میں آئی تو پرنسپل صاحبہ نے پوچھا کہاں گئی تھی، میں نے سارا ماجرا انھیں سنا دیا، وہ آپ کو بلا کر لے آئیں۔ لیکن آپ بھی اب کیا کریں گی؟

یہ کہکر وہ پھر زار زار رونے لگی۔

میں نے کرشنا سے کہا۔

"پرویں تو بڑی چھاکٹا نکلی!"

"اور کیا"

"اس کا اور بختاور کا خلا ملا کیسے ہوا؟"

تھی، اس نے میرے آنسو پونچھے،

"ارے رو رہی ہو تم تو"

میں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے، وہ پھر لپک کر میری طرف بڑھی، میں نے کہا۔

"یہ تم نے کب کی دشمنی نکالی؟"

"دشمنی کیسی؟"

"یہاں کیوں لائیں مجھے!"

"میں کیوں لاتی؟ جو تمھیں لایا وہی مجھے لایا، فرق یہ ہے کہ تم نے رو رو کر آنکھیں سجالیں۔ اور جب میں نے یہ دیکھ لیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے تو ہنس ہنس کر بھگت لیا، سب کچھ —— یہی تم بھی کرو اور دعا دو سیٹھ صاحب کو کہ وہ باپ کی طرح ہم کو چاہتے ہیں اور ہماری تفریح کا خیال رکھتے ہیں، یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

میں نے کہا۔

"میں خودکشی کروں گی"

"یہی میں نے بھی سوچا تھا پہلی مرتبہ!"

پھر اس نے میری طرف کچھ دیر تک دیکھا اور کہنے لگی۔

"اکیلے اکیلے خودکشی سے فائدہ کیا؟ یہی سوچ کر میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ لیکن اگر تمہارا پختہ ارادہ ہو تو سچ کہتی ہوں میں تمہارا ساتھ دوں گی، پہلے تم میرے گلے میں پھندا ڈالنا، پھر میں تمہارے گلے میں

"میں کیا جانوں؟"

"معلوم ہوتا ہے عرصہ سے یہ دونوں آپس میں مل رہے ہیں"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے!"

"تم نے اس سے کچھ پوچھا نہیں!"

"یہ لو، کس وقت پوچھتی، میں تو ماہرو کی باتیں سن کر سیدھی تمہارے پاس چلی آئی"

"کیا کر رہی ہے وہ اس وقت"

"سو رہی ہوگی"

"ذرا بلوا تو اسے!"

"میرے کمرے میں چلو، یہاں ماہرو کے کمرے میں ٹھیک نہیں ہوں گی، یہ باتیں!"

میں کرشنا کے کمرے میں بیٹھ گئی اور وہ پروین کو بلانے چلی گئی۔

باب ۲۵

پروین

پروین آئی، واقعی وہ سو رہی تھی، آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، وہ آتے ہی بے پروائی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

"میں کچھ باتیں پوچھنا چاہتی ہوں تم سے سچ سچ بتانا!"

اس نے ایک جماہی لی اور کہا۔

"پوچھئے"!

"ماہرو کو تم کہاں لے گئی تھیں؟"

"خاص باغ"

"کیوں؟"

"سیٹھ صاحب کا اشارہ اور بختاور کا حکم کون ٹال سکتا ہے!"

"تم بختاور کو جانتی ہو؟"

"جانتی ہوں!"

"کب سے؟"

"بہت دنوں سے!"

"تمہاری اس کی جان پہچان کیسے ہوئی؟"

"ہوگئی!"

میں نے غصہ کے ساتھ کہا

"ہوش میں آؤ پروین، تم کس سے باتیں کر رہی ہو، معلوم ہے تمہیں ——!"

"ہوش میں ہوں اور آپ سے باتیں کر رہی ہوں"

"میں پوچھتی ہوں تمہیں اور بختاور کو یہ کھیل کھیلنے کا موقع کیسے ملا؟ کب ملا؟"

"اسی تربیت گاہ میں رات کے سناٹے میں اور کب اور کیسے!"

"کیوں کر؟"

"پہرہ دار اس کا غلام ہے، رات کے اندھیرے اور سناٹے میں جب وہ آنا چاہتا ہے، وہ پھاٹک کھول دیتا ہے، جب وہ میرے کمرے کا دروازہ ہولے ہولے کھٹکھٹاتا ہے میں..... چپکے بستر پر سے اٹھتی ہوئی، اندر کی زنجیر کھول کر اُسے بُلا لیتی ہوں، جب تک اس کا جی چاہتا ہے، رہتا ہے، جب سیر ہو جاتا ہے کل کا وعدہ کر کے پھر واپس چلا جاتا ہے!"

کرشنا آئینہ حیرت بنی ہوئی اس کی بے باکی دیکھ رہی تھی، میں

بھی تعجب کے ساتھ اس کی یہ بے جھجک باتیں سُن رہی تھی، میں نے بگڑے ہوئے تیور سے کہا۔

"تمہاری اس کی آنکھیں کیسے چار ہوئیں؟ اسے یہ ہمت کیسے ہوئی اس کوٹھی میں اسے آنے کا حوصلہ کیسے ہوا؟"

"سیٹھ صاحب نے اپنے کمرے میں مجھے ایک روز بلایا، میں چلی گئی وہیں بختاور بھی بیٹھا ہوا تھا، ہماری آنکھیں چار ہوئیں، سیٹھ صاحب وہاں سے کھسک گئے، مجھے اور بختاور کو اکیلا چھوڑ کے۔ اس کی ہمت بھی بڑھ گئی اور مجھ میں بھی ہمت پیدا ہوگئی، اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا، مجھے معلوم ہوا جیسے میرے ہاتھ پر کسی نے انگارہ رکھ دیا ہو میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا، اور رونے لگی، اس نے پھر پوری قوت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور ہنسنے لگا، میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے اس دفعہ اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا، اس نے اور زور سے دبایا پھر کہا۔ آج رات کو سب ۱۲ بجے سب لوگ جب سو جائیں ــــ گے میں آؤں گا۔"

ــــــــــــــــــــــــــــــــ اس نے میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مست آنکھوں سے مجھے دیکھا، پوچھا کس نمبر کے کمرے میں رہتی ہو۔"

"۱۲ نمبر کے کمرے میں!"

"وہی جو سب سے آخر میں ہے؟"

میں نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا ــ میں نے کہا۔

سیٹھ صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں وہ مسکرائے اور اپنی عینک ٹھیک کرکے کہنے لگے۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے!"

وہ بولا

"یہ کہتی ہیں اگر کسی نے ہمیں ملتے جلتے دیکھ لیا تو؟"

سیٹھ صاحب ہنسے، کہنے لگے،

"تو، تو کیا؟ دوست سے نہ ملے گا، تو کیا دشمن سے ملے گا؟"

اس نے پھر جرح کی۔

"اور اگر پرنسپل صاحبہ ......!"

سیٹھ صاحب جھنا کر بولے

"اونہہ! پرنسپل صاحبہ وہ کیا کرلیں گی؟ میری تربیت گاہ میں، ہر شخص خود اپنا حاکم و مختار ہے، تم دونوں کو ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

بختاور نے میری طرف دیکھا، گویا پوچھ رہا تھا، کہو اب کیا کہتی ہو میں نے بھی اس کی طرف دیکھا، گویا میں کہہ رہی تھی، تم سچے ہو، آجانا جب جی چاہے۔"

رات کو جب میں اپنے کمرے میں سونے لیٹی، تو نیند کسی طرح بھی نہیں آئی، ۱۲ بجے تک میں کروٹیں بدلتی رہی کوئی ساڑھے بارہ بجے

"وہاں کیسے آؤ گے؟ اور اگر آ بھی گئے تو میرے کمرے میں کیسے پہنچو گے اور اگر پہنچ بھی گئے اور کسی نے دیکھ لیا تو کیا کرو گے؟ اور میرا حشر کیا ہوگا ——؟"

وہ کھسک کے اور میرے قریب آ گیا، اور پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ گیا، میں نے کہا۔

"ذرا دور ہٹ کر بیٹھو! سیٹھ صاحب آ گئے تو؟"

وہ ہنسنے لگا، اس نے کہا۔

"پگلی کہیں کی، سیٹھ صاحب ہی نے تو ہمیں یہ موقع دیا ہے۔ وہ یہاں سے کھسکے اس لئے ہیں کہ ہم تم ملیں اور یہ جو تم نے پوچھا کہ کیسے آؤ گے؟ تو تمہیں نہیں معلوم پہرہ دار سیٹھ صاحب کا نوکر ہے، اور سیٹھ صاحب میرے غلام ہیں، رہا تمہارے کمرے میں پہونچنا، تو جب پہریدار نے پھاٹک کھول دیا۔ تو تمہارے کمرے تک پہونچنا کیا مشکل ہے؟ اور اگر کسی نے دیکھ لیا، مجھے یا تمہیں تو بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں کس کی مجال ہے جو نجتاور سے چوں بھی کر سکے۔ منہ توڑ دوں اسی وقت سالے کا۔"

میں نے سُن رکھا تھا، سیٹھ صاحب نجتاور کو کتنا مانتے ہیں، اور وہ ان پر کتنا حاوی ہے۔ آج یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، میں مطمئن ہو گئی، اس نے میرے اطمینان کو بھانپ لیا، میرا ہاتھ چھوڑ کر الگ جا بیٹھا، پھر سیٹھ صاحب آئے، ان سے کہنے لگا۔

"یہ پروین مجھ سے دوستی کرتے ہوئے ڈرتی ہے!"

میں نے کہا۔

"تم شرم کو گھول کر پی گئی ہو، میرے سامنے اس دیدہ دلیری سے یہ باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آئی، بے غیرت کہیں کی!"

اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"آپ ہی تو پوچھ رہی ہیں، آپ نے پوچھا میں نے بتا دیا!"

"میں یہ پوچھتی ہوں کہ تم اس لئے یہاں آئی تھیں، تاکہ چاکری کا چلن، سیکھو، اپنی بیکس بہنوں کی خدمت کرو!"

"اور کس لئے آئی تھی!"

"پھر کیا خدمت، کا چلن اسی طرح سیکھا جاتا ہے، اور نفس کشی کے یہی طریقے ہیں؟"

"یہ سیٹھ صاحب سے پوچھئے، میں ان کے سامنے بھی سچ سچ کہہ دوں گی۔"

"تم نے چھپایا ہی کیا ہے؟ جو میں ان سے پوچھوں، لیکن پروین تمہیں خود بھی سوچنا چاہیئے تھا۔ کہ تم کیا کر رہی ہو، کدھر جا رہی ہو؟"

"سوچا تھا میں نے"

"پھر بھی یہ سب کچھ کر ڈالا تم نے"؟

کے قریب، میرے کمرے کے دروازے پر کسی نے ہولے ہولے دستک دی میں تڑپ کر اٹھی، دروازہ کھولا، نجتا ور کھڑا مسکرا رہا تھا، بڑا ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا، اس وقت باہر کی طرف، رات بڑی اندھیری تھی، ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا، وہ اندر آ گیا، میں نے دروازہ بند کر لیا اندر سے!

ہم دونوں پاس پاس بیٹھے تھے ..... باتیں کرنے لگے، چاہ اور پریم کی، ہر روز رات کاٹے نہیں کٹتی تھی، آج پلک جھپکاتے صبح ہوگئی، وہ انگڑائی لے کر اٹھا مجھے اس نے گلے سے لگایا، میرے گالوں کو اس نے تھپتھپایا، پھر کہنے لگا، کل پھر آؤں گا، سو نہ جانا میں نے کہا ضرور آنا، میں تمہارا انتظار کروں گی، وہ مسکراتا ہوا چلا گیا، میں اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی، پھر اس وقت اٹھی، جب پرنسپل صاحبہ نے کواڑ کھٹکھٹائے،

پروین کی ان بے باکانہ باتوں نے عجیب بے خودانہ حیرت مجھ پر طاری کر دی تھی، جب وہ یہ کہہ چکی، تو میں چونکی، میں نے کہا۔

"تم اسی لئے یہاں آئی تھیں؟"

اس نے بڑے بھولے پن سے کہا۔

"اس لئے کیوں آتی؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ نجتا ور یہاں ہے اور وہ مجھے چاہنے بھی لگے گا، خود ہی سوچئے، یہ باتیں تو از خود ہوگئیں بلا چاہے ہوئیں، بغیر مانگے ہوئیں!"

"ہاں!"

"تمہیں یقین ہے!"

"یقین ہے"

"پھر تم نے ماہرو کو اس کی بھینٹ کیوں چڑھایا۔؟ وہ تم سے بھی محبت کرتا ہے، اور ماہرو کو بھی چاہتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"وہ ماہرو کو بھی بالکل نہیں چاہتا، صرف مجھے چاہتا ہے!"

"پھر وہ ماہرو کو کیوں لے گیا تھا خاص باغ؟ کیوں اس کی زندگی تباہ کی اس نے؟ تم سے اس کی مدد کیونکر کی گئی۔؟"

"یہ تو جوانی کے کھیل ہیں، ماہرو کیا، جو بھی جوان عورت اسے مل جائے گی یہ کھیل کھیلے گا اس کے ساتھ، باقی محبت تو ایک ہی سے ہوتی ہے، اور وہ مجھی سے ہے!"

"تم نے کیسے گوارا کر لیا اسے!"

"یہ تو اس میں میرا کیا بگڑ گیا!"

"وہ بدمعاش ہے!"

"ہوا کرے!"

"آوارہ ہے!"

"مجھ سے کیا؟"

"کمینہ ہے!"

"اپنی اپنی رائے ہے!"

"جی ہاں!"

"بڑی حیرت ہوتی مجھے!"

"کیوں حیرت ہوتی ہے آپ کو؟ ——— میں یہاں اس لئے آئی تھی کہ اس دنیا میں میرا کوئی چاہنے والا نہیں تھا، شوہر مر چکا تھا، سماج ٹھکرا چکی تھی، ماں باپ بہت پہلے سدھار چکے تھے، چچا کا گھر میرے لئے جہنم تھا، اٹھتے جوتی بیٹھتے لات، میں اپنی حقیقت کو اپنے وجود کو، اپنے حسن کو، اپنی جوانی کو بھول چکی تھی، دل تھا میرے سینہ میں اور وہ مچلتا بھی رہتا تھا۔ لیکن میں اس سے کہتی تھی تو کس لئے مچل رہا ہے، کوئی تجھ پر تھوکتا بھی نہیں، وہ مچلتے مچلتے سنبھل جاتا تھا روتے روتے بہل جاتا تھا، پھر چچا نے آپ کا اشتہار پڑھا، اور مجھے یہاں بھیجدیا۔ میں یہاں آئی اور اپنے کام میں لگ گئی۔ ——— لیکن کچھ ہی دن بعد نجتاور کی نگاہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میں حسین ہوں، جوان ہوں، میرا دل پھر مچلنے لگا، اور مچلتے مچلتے پہونچ گیا اس کی گود میں، اس میں میری کوئی خطا ہو تو آپ بتائیے، میں قائل ہو جاؤں گی۔

میں نے کہا

"میں بحث کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن ایک بات اور پوچھتی ہوں"

"پوچھئے!"

"نجتاور تم سے محبت کرتا ہے!"

کماری تو بے چاری صرف رونے پر اکتفا کر رہی تھی، میں اٹھی، میں نے زور کا ایک تھپڑ اسے مارا، لیکن اس نے اپنی کہنی پر میرے تھپڑ کو روک لیا، الٹے میرے چوٹ آگئی!

میں سنبھل گئی، میں نے سوچا یہ مار پیٹ کرنے کو تیار ہے سیٹھ صاحب کی شہ اور نجتاور کی چاہت نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے پھر میں خاموش بیٹھ گئی، وہ بھی چپ چاپ بیٹھی رہی،

میں نے اس سے کہا۔

"اب تم اس تربیت گاہ میں نہیں رہ سکو گی!"

"میں خود رہنا نہیں چاہتی یہاں ——— اس سوال کو میں پہلے ہی سے حل کر چکی ہوں!"

"کیا مطلب؟ کہاں جاؤ گی؟ کس کے پاس رہو گی؟"

"خاص باغ چلی جاؤں گی، نجتاور کے پاس رہوں گی، نجتاور مجھ سے وعدہ کر چکا ہے، وہ اپنے وعدے سے پھر تھوڑے ہی جائے گا"

مجھے پر وہیں پر اس وقت غصہ بھی آرہا تھا، اور ترس بھی آرہا تھا، کتنی بیوقوف ہے، کتنا اعتماد ہے اسے نجتاور پر، میں نے کہا۔

"اس کی شادی ہو چکی ہے!"

"مجھے معلوم ہے!"

"پھر بھی تم اس کے ساتھ رہو گی؟"

"کیوں نہیں جب دوسری شادی شدہ عورتیں اس سے

کرشنا کماری اب تک چپ بیٹھی تھیں، اب وہ بھی بولیں۔

"تو بھی بدمعاش ہے!"

"کون بدمعاش نہیں ہے!"

"میں بدمعاش ہوں؟ شیریں بدمعاش ہے؟"

"دونوں بدمعاش ہیں"

"مجھے تو نے کہا تو کہا، لیکن شیریں کو بھی کہہ رہی ہے، اس دیوی کو؟"

"چلو جانے دو، کون دیوی ہے اور کون بدمعاش ہے، میں سب جانتی ہوں!"

"کیا جانتی ہے تو؟"

"مجھے سب بختاور نے بتا دیا ہے!"

"کیا بتایا ہے؟ کچھ تو کہہ!"

"وہ پہرے دار نہیں آیا کرتا راتوں کو تمہارے کمرے میں!"

یہ کہہ کر وہ ذرا کے ذرا رکی، پھر اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"انھیں بھی خوب جانتی ہوں، بختاور نے جو کھیل ماہرو سے کھیلا ان سے بھی کھیل چکا ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی ایک ایک بات بتا دی ہے، اپنی!"

غصہ کا ضبط کرنا اب میرے قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ کرشنا

باب ۲۶
آپس کی باتیں

پردیں کے جانے کے بعد میں نے کرشنا کماری سے کہا۔
"سن لی جی بھر کے اس چھوکری کی باتیں؟"
"خوب سن لیں!"
"اب کیا کہتی ہو اب کیا کیا جائے؟"
"میں کیا بتاؤں؟ تم مالک مختار ہو جو چاہو کرو!"
"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں کرتی!"
"میری خود عقل کام نہیں کرتی!"
"سوچتی ہوں تربیت گاہ بند کردوں"
"کردو بند، لیکن بختاور کا علاج بھی تم نے کچھ سوچا؟"
"یہی تو ٹیڑھا سوال ہے!"

خلا ملا رکھ سکتی ہیں، تو میں کیوں نہیں رکھ سکتی؟"

یہ میرے اوپر چوٹ تھی، نجتاور نے اُسے کامل یقین دلادیا تھا کہ وہ مجھے بھی سرفراز کر چکا ہے۔ مجھے ہنسی آئی، لیکن میں ضبط کر گئی۔

میں نے اس سے کہا۔

"میں تو تھوکتی بھی نہیں اُس موئے کتے پر!"

"سب معلوم ہے!"

اب مجھے غصہ نہیں آرہا تھا، اس کی سادہ لوحی پر ہنسی آرہی تھی، لیکن میں اپنے غصہ کو قائم رکھنا چاہتی تھی، مجھے سیٹھ صاحب سے لڑنا تھا، نجتاور کا فیصلہ کرنا تھا، اس تربیت گاہ کو بند کرنا تھا اور نہ صحیح اسلوب پر چلانا تھا۔

میں نے آہستگی کے ساتھ اس سے کہا

"اچھا اب تم جاؤ!"

اسے نیند آرہی تھی، جماہی لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور چلی گئی اپنے کمرے کی طرف،

اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ ہے؟"

"میں نے خوب اندازہ لگا لیا ہے، حالات کا سیٹھ صاحب اور نجتاور تو ایلی مجنوں ہیں، ان دونوں کو تم کیا، دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں چھڑا سکتی، رہی یہ تربیت گاہ تو میں خوب جانتی ہوں، نہ تم اسے بند کر سکتی ہو، نہ سدھار سکتی ہو اور تمہاری زندگی اب روتے ہی کٹے گی بہن!"

"یہی میرا دل بھی کہہ رہا ہے!"

انہی باتوں میں رات ختم ہوگئی، میں نے کہا،

"لو بہن سویرا ہوگیا، ساری رات یہیں کی الجھنوں میں کٹ گئی، اب میں جاتی ہوں!"

"لیکن تم نے سوچا کیا، فیصلہ کیا کیا!"

"اس وقت میرا دماغ مختل ہو رہا ہے، میں سوچنا چاہوں، تو بھی کچھ نہیں سوچ سکتی، ذرا اور صبر کرو، اب تو میں جاتی ہوں۔ مگر آج ہی کل میں کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کر دوں گی، دیکھو بہن تمہیں اپنی محبت کی قسم دیتی ہوں، جب تک میں فیصلہ نہ کر لوں، یہاں سے کہیں جانے کا نام نہ لینا!"

میں اپنے کمرے میں واپس آئی، اور نڈھال ہو کر لیٹ گئی، سیٹھ صاحب کی حرکتیں، نجتاور کے کرتوت، ماہرو کی تباہی، پروین کی بیباکی اپنی بے بسی، ہر چیز مجھے یاد آرہی تھی، اور خون کے آنسو رلا رہی

"ایک بات پوچھوں بُرا تو نہ مانو گی!"

"پوچھو نہیں مانو گی بُرا!"

"یہ سیٹھ صاحب اور نجتاور کا کیا معاملہ ہے؟ میں نے تو کہیں بھی یہ تماشہ نہیں دیکھا۔ جو یہاں دیکھ رہی ہوں، مواہے نوکر، لیکن آقا کو غلام بنائے ہوئے ہے!"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، شرم سے میں زمین میں گڑ گئی میں نے کہا

"میں کیا جانوں؟ جو تم دیکھ رہی ہو، وہی میں دیکھ رہی ہوں!— مجھے دیکھو اور عبرت حاصل کرو، میں بظاہر کتنے آرام میں ہوں، کتنی شاندار زندگی بسر کر رہی ہوں، لیکن میرا دل ہر وقت روتا ہے، میری آنکھوں کے آنسو کبھی تھمتے، مجھ سے زیادہ مصیبت اس دنیا میں کسی پر نہیں پڑی ہوگی!"

"ہاں بہن سچ کہتی ہو، یہ تمہارا دل گروہ ہے کہ یہ سب کچھ جھیل رہی ہو، میں تمہاری جگہ ہوتی، تو زہر کھا لیتی، اور گلا گھونٹ دیتی اس موئے بڈھے کھوسٹ کا، آیا ہے کہیں سے بڑا دھنا سیٹھ بن کر بدمعاش کہیں کا!"

"گالیاں دینے سے کیا ہوگا اکرشنا کچھ سوچو مجھے بتاؤ، اس مصیبت سے نجات کیونکر ہوگی، سیٹھ صاحب کو میں نجتاور سے گیے واپس لوں، تربیت گاہ کو پاپ کے بھنور سے کیوں کر نکالوں؟ سکون اور

بڑھاؤں اور اسی کی ہو رہوں، اگر وہ اس بڑھاپے میں بھی مستی اور سرمستی کی زندگی بسر کرنے کی تمنا سے بھرپور ہیں۔ تو میں اپنی یہ مست جوانی کیوں سربمہر شراب کی بوتل کی طرح کسی کوٹھڑی میں بند پڑی رہنے دوں، میں بھی کیوں نہ کھیل کھیلوں؟ میں بھی کیوں نہ اپنے جذبات کا منہ کھول دوں میں بھی کیوں نہ لطف اٹھاؤں اور عیش کی زندگی بسر کروں، جو دنیا مجھے بُرا کہے گی، کیا وہ سیٹھ صاحب کو کچھ نہ کہے گی، اُنھیں معاف کر دے گی؟

یہ باتیں سوچتے سوچتے میرے اوپر ایک بحرانی کیفیت سی طاری ہوگئی۔ جی چاہتا تھا کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جاؤں، اس دنیا سے کہیں بہت دور چلی جاؤں، کوئی مجھ تک نہ پہونچ سکے، میں سب کی پہونچ سے دور ہو جاؤں"

پھر میرے دل میں خیال آیا۔ میں اپنی قربانی کو رائیگاں کیوں کروں، آدمی جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے، سیٹھ صاحب نے جو بویا ہے، وہ کاٹیں گے۔ میں جو بو رہی ہوں وہ کاٹوں گی، میرے اعمال میرے ساتھ ہیں اور ان کے افعال ان کے ساتھ!

لیکن اس تربیت گاہ کا کیا کروں، اگر نجتاور یہاں رہے گا تو ضرور اسی طرح کے گل کھلتے رہیں گے، ضرور معصوم اور بے گناہ لڑکیاں پاپ کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کی جایا کریں گی۔ میں نے سوچ لیا، آج میں آخری اور فیصلہ کن گفتگو سیٹھ صاحب سے کروں گی

تھی، یہ واقعات میری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی، نہ پلک جھپکتی تھی، نہ نیند آتی تھی،

صبح کا اخبار آیا ہوا پڑا تھا میں اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی، اغوا کی ایک خبر پر میری نظر پڑی، لکھا ہوا تھا کہ ایک آدمی اپنے پڑوسی کی نوجوان بیٹی کو بھگا کر لے گیا، لڑکی ایک خط چھوڑ گئی ہے میں اپنی خوشی سے جاتی ہوں، اپنے جیون ساتھی کے ساتھ، مجھے ڈھونڈنے کی کوشش بیکار ہوگی،

یہ خبر پڑھتے ہی مجھے جمشید یاد آگیا۔ اس کی اغوا پرستی کی باتیں یاد آگئیں، پہلی مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ کیسی مکروہ اور گندہ زندگی ہے میری میں بھی تو خوبصورت ہوں، جوان ہوں، دلکش ہوں، کشش رکھتی ہوں، مجھے کیوں کوئی نہیں بھگا لے جاتا، میں کیوں نہیں کسی کے ساتھ روپوش ہو جاتی ہوں؟ بدنامی ہوگی، رسوائی ہوگی۔ لیکن میرے پیچھے میں تو چین کی زندگی بسر کروں گی، لیکن مجھے کون بھگا لے جائے گا، میں کس کے ساتھ فرار ہو جاؤں!"

اگر سیٹھ صاحب کو یہ حق ہے کہ وہ میری زندگی بغیر کسی خطا کے تباہ کر دیں، تو ان کی گھناؤنی خطا کے باوجود میں کیوں نہیں ان کی زندگی تباہ کر سکتی، اگر انھیں یہ حق ہے کہ وہ ایک ناجنس کی محبت پر اپنی دولت اپنی عزت اور وقار کو بھینٹ چڑھا دیں، تو آخر مجھے یہ حق کیوں نہیں ہے کہ میں فطری جذبات کے ماتحت، کسی ہم جنس سے پینگ

باب ۲۷
زوردار مقابلہ

میں اسی کش مکش خیال میں لیٹی ہوئی کروٹیں بدل رہی تھی، کہ دبے پاؤں سیٹھ صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے، انھیں دیکھتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، ان کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار تھے نہ اضطراب اور پریشانی کے، وہ اطمینان سے میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمانے لگے۔

"بہت دیر لگا دی واپس آنے میں وہاں اب تک کیا کرتی رہیں تم؟"

"اپنی قسمت کو رو رہی تھی"

وہ ہنسے اور کہنے لگے۔

"یہ کام تو یہاں بھی ہو سکتا تھا، وہاں جانے کی اور رات بھر رہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اگر وہ اس پر راضی ہو گئے کہ نجاور کو نکال کر اور تربیت گاہ کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ تو میں ان سے بے تعلق ہو جاؤں گی۔ ان کا جو بھی جی چاہے کریں، مجھے ان سے کوئی مطلب نہیں، میں نے تیاگ، ترک اور خدمت کا جو راستہ اختیار کر لیا ہے، اسی پر چلتی رہوں گی اور اسی پر چلتے چلتے ایک روز منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گی۔

ہاں اگر انھوں نے میرے یہ معمولی شرائط بھی نہ مانے، نجاور کو اپنے ساتھ رکھنے پر مصر رہے۔ اور وہ تربیت گاہ کو ناپاک اور گندہ بنانے کی حرکتیں کرتا رہا۔ تو خواہ دنیا مجھے کچھ بھی کہے۔ میں ان کا مقابلہ کروں گی۔ خواہ کتنی ہی رسوائی ہو ہم دونوں کی، دنیا کو بتا دوں گی کہ ان کے بوڑھے دل میں کیسا پاپی اور نوجوان دل مچل رہا ہے۔ وہ دل جو اپنے ساتھ نہ جانے کتنے بے گناہوں کو گناہ اور پاپ کے بھنور میں پھنسا چکا ہے۔

میری آنکھوں سے غصہ کے مارے شعلے نکل رہے تھے۔ گویا سیٹھ صاحب یہیں ہیں اور میری ان سے تیز تیز گرم گرم گفتگو ہو رہی ہے حالانکہ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں تھی، صرف میں، تن تنہا، ہاں سیٹھ صاحب کا خیال ضرور تھا!

بتا دوں گی۔ کہ یہ حاتم دوراں کس چال چلن کا آدمی ہے میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔ اور اسے ماہردکی اور اپنی فریاد سناؤں گی۔ میں پنچایت کو بلاؤں گی۔ اور اس کے سامنے میں آپ کا کچا چٹھا رکھ دوں گی۔ تب جاؤں گی یہاں سے!"

"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟"

"اگر یہ دھمکی ہے تو دھمکی ہی سہی!"

"لیکن تم اس حقیقت کو بھول رہی ہو کہ، روپیہ سے انصاف بھی خریدا جا سکتا ہے، پنچایت کی رائے بھی، اور اخبارات کے کالم بھی ——— تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔ میں تمہیں منع نہیں کرتا، اگر تم چاہو تو اپنا یہ حوصلہ نکال دیکھو!"

میں روپیہ کی طاقت سے واقف تھی۔ لیکن اس وقت اپنے جوش اور غصہ میں اپنی طاقت کو اس سے بڑھا ہوا محسوس کر رہی تھی سیٹھ صاحب کی یہ باتیں سن کر میری ہوش کی آنکھیں کھلیں، اور میں سوچنے لگی، واقعی سچ کہتے ہیں یہ، میرا ان کا مقابلہ کیا؟ میں رائی اور یہ پربت، جب یہ چاہیں کچل سکتے ہیں۔ مجھے اور میری آواز کو!

میرا جوش سوڈا واٹر کی طرح فوراً ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں انہی کو اپنا ہمدرد بنا کر اور رہنما سمجھ کر پوچھنے لگی۔

"تو پھر کیا کروں میں!"

"میں تمہاری ماہوار رقم مقرر کر دیتا ہوں۔ جہاں چاہو رہو!"

میں نے جواب دیا۔

"تھی ضرورت یہاں اپنی خانہ خرابی پر اکیلی روتی، وہاں ایک ساتھی بھی مل گیا تھا!"

"کون کرشنا؟"

"جی ہاں!"

"بڑی بدمعاش عورت ہے نکال دوں گا اُسے!"

"اسے کیوں نکالیں گے آپ؟ اس نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی ہے جو بدمعاش ہے اسے نکال باہر کیجئے!"

"شاید تم نجتاور کی طرف اشارہ کر رہی ہو؟"

"آپ صحیح سمجھے میں اسی کو کہہ رہی تھی!"

"میں اسے نہیں نکال سکتا!"

"تو پھر کرشنا کے ساتھ مجھے بھی رخصت کر دیجئے!"

اب سیٹھ صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے، انھوں نے کہا

"اگر تم چاہو تو جا سکتی ہو!"

"لیکن میں اس طرح نہیں جاؤں گی!"

"پھر کس طرح جاؤ گی؟"

"آپ کو بے نقاب کر کے!"

"وہ کس طرح؟"

"میں اخبارات میں آپ کے خلاف مضمون لکھوں گی اور دنیا کو

"اور تربیت گاہ!"

"اسے مجھ پر چھوڑ دو، میں جو چاہوں کروں"

"آپ پر چھوڑ دوں یا بختاور پر!"

"تم مجھے اور اسے الگ الگ کیوں سمجھتی ہو۔ مجھ پر چھوڑا تو اس پر چھوڑا، اس پر چھوڑا۔ تو مجھ پر چھوڑا!"

اپنے بارے میں، میں سیٹھ صاحب کی پیشکش منظور کر لینے پر تقریباً تیار ہو گئی تھی۔ لیکن تربیت گاہ کے بارے میں سیٹھ صاحب کا فیصلہ سن کر اور بختاور کے بارے میں ان کے محبت بھرے جملے سن کر میں لرز گئی، مجھے غصہ آ گیا، میں نے پھر کر ان سے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا!"

"اگر یہ نہیں ہو سکتا۔ تو تمہیں اختیار ہے، جو تمہارا جی چاہے کرو میں تمہیں آزادی دیتا ہوں۔"

"مجھے آپ کی آزادی کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ سب کچھ یقیناً میں کروں گی۔ جو میرا جی چاہے گا۔ میں آپ کو ایسا پاپی اور کٹھور نہیں سمجھتی تھی۔"

"اب سمجھ لو!"

"ہاں اب سمجھ رہی ہوں، خوب سمجھ رہی ہوں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ دنیا میں جس طرح انسان کے روپ میں اوتار ہوتے ہیں، اسی طرح اوتار کے روپ میں شیطان بھی ہوتے ہیں۔ پہلے میں آپ کو

اوتار سمجھتی تھی، اور اب میں آپ کو شیطان سمجھ رہی ہوں!"

"میری یہ جلی کٹی باتیں سن کر سیٹھ صاحب ذرا بھی نہیں بگڑے، الٹے مسکرانے لگے ـــــ انھوں نے بڑی بے پروائی کے ساتھ کہا۔

"تو میں سمجھ لوں تم اپنے فیصلہ پر قائم ہو۔"

"سمجھ لیجئے!"

"میں چاہتا ہوں، ایک دفعہ پھر تم غور کرو!"

"کر چکی غور، زیادہ غور کروں گی، تو میرا دماغ پھٹ جائے گا!

ـــــ اب آپ جائیے!

"ہاں میں جا رہا ہوں۔ لیکن میں جاتے جاتے، پھر تم سے کہتا ہوں دانشمندی یہی ہے کہ تم میرے کہنے پر عمل کرو، کرشنا اپنے ساتھ تمہیں بھی تباہ کرنا چاہتی ہے!"

"لیکن آپ نے اور آپ کے بختاور نے بھی تو مجھے تباہ کر دیا، پھر میں کرشنا کا گلہ کیوں کروں، وہ بے چاری تو پھر غیر ہے!"

میں نے سیٹھ صاحب کے چہرے پر نظر دوڑائی کہ دیکھوں ان پر میری باتوں کا کیا ردِ عمل ہوا۔ لیکن نظر سیٹھ صاحب کے چہرے سے پہلے دروازہ پر پہونچ گئی۔ میں نے بختاور کو دیکھا اوٹ سے لگا کھڑا ہے، اور بڑے انہماک سے ہماری باتیں سن رہا ہے۔

میں نے کڑک کر پوچھا، "یہ بختاور کیوں کھڑا ہے یہاں!"

وہ تو جلدی سے سٹک گیا، سیٹھ صاحب پورے اطمینان کے ساتھ بولے

"میرے ساتھ آیا تھا!"

"جاسوس بن کر!"

"یہی سمجھ لو!"

"میاں بیوی کی باتیں سننے کا ایک غیر مرد کو کیا حق ہے؟"

"لیکن اگر وہ باتیں اسی "غیر مرد" کے بارے میں ہو رہی ہوں تو اسے ضرور حق ہے میاں بیوی کی باتیں سننے کا!"

"اسے کیا معلوم ہم دونوں میں کس قسم کی باتیں ہوں گی!"

"یہ کہہ تو رہا ہوں وہ میرے ساتھ آیا تھا۔ اور جب وہ میرے ساتھ آیا۔ تو ضرور اسے یہ خیال تھا کہ میں یہاں کیوں آرہا ہوں، اور کیا باتیں کروں گا تم سے!"

"پھر آپ اپنے ساتھ اسے یہاں کیوں نہ لیتے آئے!"

"میں تو لا رہا تھا، وہ خود نہیں آیا!"

"کیوں ——— ؟"

"اس نے ٹھیک بات کہی، اس نے کہا میرے سامنے کھل کر باتیں نہیں کر سکیں گے آپ لوگ!"

"اوہو تو گویا میں ڈرتی ہوں اس موئے کمینہ سے!"

"ڈرنے کا کچھ سوال نہیں ہے۔ یہ کچھ انسانی فطرت ہے کہ مابالنزما آدمی کے سامنے ہم زیادہ کھل کر گفتگو نہیں کر سکتے، کچھ لحاظ آہی جاتا ہے بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جو دل سے زبان تک آنا چاہتی ہیں،

کسی تیسرے کو موجود دیکھ کر پھر واپس آجاتی ہیں۔ اور دل کی دل ہی میں رہتی ہیں ——— ہم دونوں تمہیں یہ موقعہ دینا چاہتے تھے کہ تم اپنے دل کی ہر بات بے جھجک ہو کر بیان کر سکو، کہہ سکو ——— بجائے اس کے کہ تم شکر گذار ہو، اور زیادہ خفا ہو رہی ہو، اس غریب پر، واقعی عورتوں کا مزاج بھی عجیب ہوتا ہے ——— !"

سیٹھ صاحب کے منہ سے "ہم دونوں" کا لفظ سن کر پھر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، لیکن میں بے بس تھی، میں نے اپنے غصہ کو دبایا، اور خاموش ہو گئی!

جاتے جاتے سیٹھ صاحب نے فرمایا۔

"میں اب جاتا ہوں، تمہیں غور و فکر کا پورا پورا موقع دیتا ہوں آخری اور فیصلہ کن گفتگو کسی اور وقت ہوگی!"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، ان کے جاتے ہی پڑ گئی۔ منہ ڈھانپ کے ——— !

باب ۲۸
بھوکا شیر

سیٹھ صاحب چلے گئے، اور میں پھر حال و مستقبل کی فکر میں پڑ گئی۔ نہ نیند آتی تھی، نہ کسی رائے پر طبیعت جمتی تھی، سارا دن اسی کش مکش میں گزر گیا۔

میرا عجیب حال ہو گیا تھا۔ نہ میں نے کھانا کھایا، نہ باہر نکلی، نہ کسی سے ملی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی ہوئی تھی، کبھی رونے لگتی تھی، کبھی آنسو پونچھ کر کچھ سوچنے لگتی تھی، ناشتہ آیا اور واپس گیا کھانا چنا گیا، اور دسترخوان اٹھا لیا گیا۔ نوکر بھی میرا یہ رنگ دیکھ کر کچھ سہمے سہمے سے تھے، مجھ سے کچھ پوچھنے یا بات کرنے کا حیاؤ نہیں پڑتا تھا ان کا، مجھ سے الگ الگ رہتے تھے،

دن ختم ہو گیا، رات آ گئی میں ——— اپنے کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ زندگی میں کبھی بھی ایسی ذہنی کوفت اور دماغی الجھن سے مجھے

سابقہ نہیں پڑا تھا۔ کبھی جی میں آتا، خودکشی کر لوں، کبھی سوچتی کہیں روپوش ہو جاؤں، کبھی یہ جوش آتا کہ سیٹھ صاحب کو خوب خوب رسوا کروں، اور انھیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رکھوں، کبھی یہ جی چاہنے لگتا، کہ تھوڑا سا زہر بخت اور سیٹھ صاحب کو دیدوں، اور ہمیشہ کے لئے پاپیوں کا خاتمہ کر دوں، اگر پکڑی جاؤں۔ تو عدالت میں سارا واقعہ بیان کر دوں، یہ مختلف تجویزیں میرے زیر غور تھیں۔ جب کسی ایک تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیتی، تو پھر خود بخود وہ فیصلہ کمزور پڑ جاتا اور کوئی دوسری تجویز سامنے آ جاتی۔

اسی طرح رات کے نو بج گئے اور میں بلا ارادہ سو گئی۔ کل رات بھر جاگی تھی، آج دن بھر الجھنوں میں گرفتار رہی تھی، بدن ٹوٹا جا رہا تھا آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، دماغ تھکا ہوا تھا، یہی وہ موقع ہوتا ہے جب پھانسی کے تختے پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ میں جس الجھن میں گرفتار تھی۔ وہ نیند اڑا دینے کے لئے کافی تھیں، لیکن پھر بھی مجھے نیند آ گئی اور میں سو گئی، بتی جل رہی تھی، اور کمرہ کھلا ہوا تھا۔

سوتے سوتے میں نے محسوس کیا کہ میں کسی کی گرفت میں ہوں، آنکھ کھلی۔ تو میں بخت اور کے مضبوط ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ بتی اب بھی جل رہی تھی، کمرے کا دروازہ بند تھا، وہ میرے اوپر اس طرح جھکا ہوا تھا، جیسے میں لقمہ تر ہوں، اور وہ مجھے کھایا ہی چاہتا ہے،

بختاور اس وقت بھوکا شیر تھا، وہ ایک ہی وار میں میرا کام تمام کر دینا چاہتا تھا۔ اپنی پیاس بجھا لینا چاہتا تھا۔ آج تک میں کسی مرد سے ہم آغوش نہیں ہوئی تھی۔ اور اس وقت میں بڑی کشمکش میں گرفتار تھی، بجلی کی وہ رو جو بختاور کے بدن سے نکل رہی تھی، میری رگ رگ میں سمائی جا رہی تھی، ایک عجیب ناقابل بیان کیفیت اس کی گرفت سے میرے اوپر طاری ہوئی جا رہی تھی، میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے، اپنے دبے، دبائے جانے، بھینچے بھینچے جانے، تڑپنے، تڑپائے جانے کی بے بسی میں ایک خفیف سی بے جانی پہچانی لذت بھی میں محسوس کر رہی تھی، لیکن بختاور سے مجھے نفرت تھی، وہ لذت فوراً ختم ہو جاتی تھی۔ جب مجھے یہ خیال آیا تھا کہ وہ یہ شخص ہے۔ جس نے ماہرو کی معصومیت کو داغ دار کر دیا۔ جس نے پردیس کو اپنی ہوس کا شکار بنایا، جو سیٹھ صاحب کو اسی طرح اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کے بازوؤں کی گرفت میں، میں نہیں ہوں، سیٹھ صاحب ہیں، دفعتہً مجھ پر نفرت کا ایک طوفان طاری ہو گیا، اس کا منہ میرے منہ کے قریب تھا، مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ دہکتا ہوا شعلہ ہے، جو مجھے جھلس دینا چاہتا ہے، خاکستر کر دینا چاہتا ہے جھلسا کر!

میں اپنی بے بسی محسوس کر رہی تھی، میں نے محسوس کیا، اگر میں

میں کسمسائی، تڑپی، زور لگایا میں نے، لیکن میرا اس کا مقابلہ ہی کیا۔ میں عاجز آ کر پوری طاقت اس کے پنجے سے چھوٹنے پر صرف کر رہی تھی وہ مسکرا مسکرا کر اپنی گرفت کو اور مضبوط کرتا جا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ماہرو کی تصویر پھر گئی مجھے خیال آیا، اسی طرح اس بدمعاش نے ماہرو کو بے بس کیا ہوگا۔ لیکن ماہرو غیر تھی۔ اور میں اس کے آقا کی بیوی ہوں۔

مجھے یقین ہو گیا۔ میں اس کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتی، جتنا جتنا میں تڑپوں گی، اتنا ہی اتنا یہ شکنجہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا شیر جب بھوکا ہوتا ہے۔ تو اس کی آنکھیں خونخوار ہو جاتی ہیں۔ اس کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے پنجوں میں زیادہ دم آ جاتا ہے وہ اپنے شکار کو جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ بلی اپنے شکار سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے کبھی چوہے کو چھوڑ دیتی ہے۔ کبھی پکڑ لیتی ہے۔ کبھی اسے بھاگنے کا موقع دیتی ہے۔ اور کبھی پھر اس پر جھپٹ پڑتی ہے۔ لیکن شیر جب بھوکا ہو اور کوئی بکری اس کے ہاتھ آ جائے تو وہ انتظار نہیں کرتا، پہلوانی کے داؤ پیچ نہیں دکھاتا۔ بلی کی طرح پینترے نہیں بدلتا، ایک ہی وار میں اپنے شکار کو صید زبوں بنا کر زمین پر ٹپک دیتا ہے اس کا خون پی لیتا ہے، اس کی بوٹیاں کھا لیتا ہے، اس کی ہڈیاں پھینک دیتا ہے۔

"نہیں تو کیا تمہاری طرح پہلوان ہوں!"

وہ ہنسنے لگا، اس نے اپنی گرفت سے مجھے آزاد کر دیا لیکن اب بھی بالکل مجھ سے ملا ہوا بیٹھا تھا۔ میں نے اس پر مسکراہٹ کی بجلی گرائی اور اسے آہستہ سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"ذرا ہٹ کے بیٹھو، ایسی بھی کیا بے قراری، کیا نگل جاؤ گے مجھے ——— ؟"

وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا، مسکرا کر کہنے لگا۔

"آج تمہیں کھانے ہی تو آیا ہوں!"

"کھاؤ جا کے اپنی ماہرو کو!"

"اس میں وہ سواد کہاں جو تم میں ہے!"

"اور پرویں میں!"

"وہ تمہاری جوتی کی خاک بھی نہیں ہے!"

"باتیں بنانا کوئی تم سے سیکھ لے!"

"سچ کہہ رہا ہوں میں!"

"بالکل سچ نہیں جھوٹ، جھوٹے ہو تم!"

"جو چاہو کہہ ڈالو اختیار ہے تمہیں!"

"اہا، ایسے ہی تو ہو کہ جو کہوں گی، وہ سن لوگے، جو کہوں گی، وہ مان لوگے!"

"اور نہیں تو کیا۔ ؟"

اس سے اکڑوں گی، تو میں اس کے ہاتھ سے بچ کر نہیں نکل سکتی، یہ شیر ہے میں بکری ہوں، یہ اپنی من مانی کر کے رہے گا۔ اور میں ماہرو کی طرح رونے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکوں گی،

میں نے بڑی ملائمت کے ساتھ کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟ میں گھٹی جا رہی ہوں، ذرا اپنے ہاتھ ڈھیلے کرو، میں سانس تو لوں!"

اسے اپنے حسن مردانہ پر ناز تھا، وہ سمجھ گیا، شکار آ گیا جال میں اسے مجھ سے اندیشہ تھا کہ میں چیخوں گی، تڑپوں گی، اسے پریشان کروں گی، لیکن اس نے دیکھا کہ میں بڑی ملائمت سے باتیں کر رہی ہوں اور ملائمت بھی وہ جس میں لگاوٹ شامل ہو، اسے یہ یقین ہو گیا کہ میں اس کے حسن مردانہ کی اسیر ہو گئی ہوں، وہ مجھ سے انتقام لینے اور میری زبان بند کرنے آیا تھا۔ اب وہ مجھے اپنا اسیر دام سمجھ رہا تھا، وہ مسکرایا، اس نے اپنا شکنجہ ڈھیلا کیا، لیکن میں اب بھی گھٹی گھٹی سی تھی، میں نے کہا۔

"تو یہ کیا مار ڈالو گے، مجھے چھوڑو تو۔ میں کوئی بھاگی جا رہی ہوں ——!"

اس نے منہ بنا کر، مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہنہ! بڑی نازک!"

میں نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا۔

لے کر دھڑام سے گرے تھے!"

وہ ہنسا، کہنے لگا۔

"وہ اور بات تھی

"کوئی اور کوئی بات نہیں۔ تم تو مجھے خراب کرنا چاہتے ہو، چاہتے تھوڑے ہی ہو ——!"

"کہہ تو رہا ہوں وہ اور بات تھی، تم سیٹھ صاحب سے میری شکایت کیوں کر رہی تھیں، میں بھی جل گیا!"

"اے واہ جل گئے تو میری جان کے لاگو ہو گئے، اچھی محبت ہے یہ ——!"

"میں تو بھیا کھڑا کھیل فرخ آبادی جانتا ہوں۔ کوئی میرے خون کا پیاسا ہو، تو چاہے جتنی میرے دل میں اس کی محبت ہو، میں بھی خون چوس لوں گا اس کا!"

میں نے مسکرا کر کہا!"

"اچھا تو یہ بات تھی!"

وہ بولا،

"اور نہیں تو کیا۔؟"

میں نے لگاوٹ کی نگاہ سے اسے دیکھا، وہ بے قابو ہو گیا،

میں نے کہا۔

"اچھا ایک بات بتاؤ!"

"تو گویا آپ مجھے چاہتے ہیں!"

"بے شک!"

"پھر آج کے دن تک کہاں تھے، پھانسا پرویں کو، چنگ بڑھائے ماہرو سے اور چاہتے مجھے ہو؟ خوب محبت ہے یہ بھی بھئی!"

میں ہنسنے لگی، وہ بھی ہنسا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"تم تو خفا ہو گئیں!"

"مجھے جھوٹ سے بڑی نفرت ہے۔"

"میں جھوٹ کب بول رہا ہوں!"

"تو اور کیا بول رہے ہو، بتاؤ نا، اگر تمہیں مجھ سے محبت تھی، تو ماہرو اور پرویں پر کیوں لٹو ہوتے رہے؟ میری تو تم نے کبھی بات بھی نہیں پوچھی کبھی ہنس کر بھی نہیں بولے۔ کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں، اور چاہتے مجھے تھے، کون مان لے گا تمہاری یہ باتیں!"

"تمہیں ماننا پڑیں گی!"

"کوئی زبردستی ہے!"

"تم پر زبردستی کرنے کا دل کہاں سے لاؤں؟"

"اس دن سیٹھ صاحب کے سامنے مجھ پر غصہ میں لپکے جو تھے!"

"کب؟"

"وہی جب میں نے تمہارے لات ماری تھی، اور تم سیٹھ صاحب کو

اس عورت کی زبان!"

"ہائے۔"

"ہاں اور کیا۔؟"

"اور تم نے یہ نہ سوچا کہ اگر سیٹھ صاحب کو پتہ چل گیا۔ تو وہ کیا کہیں گے۔؟"

اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"وہ کچھ کہہ سکتے ہیں مجھے؟"

"میرے معاملے میں بھی نہیں!"

"نہیں!"

"اتنا بھروسہ ہے تمہیں ان پر!"

"ہاں!"

"آخر کیوں؟"

"ہے یہ ایک راز کی بات کیوں بتائیں"؟

"میں پوچھوں جب بھی نہیں بتاؤ گے تم!"

"بتانے والی نہ ہو، تو بھی بتا دوں!"

"ہاں بتانا پڑے گا تمہیں میں جو پوچھ رہی ہوں!"

"اچھا بتا دوں گا!"

"تو پھر بتا دو نا"

"ابھی نہیں، پھر کبھی!"

"پوچھو!"

"کب سے محبت کرنے لگے مجھ سے!"

"بتادوں سچ سچ!"

"ہاں بالکل سچ سچ بتانا، ذرا بھی جھوٹ بولے تو زبان کاٹ لوں گی تمہاری!"

"جب سے تمہیں دیکھا ہے!"

"دیکھو پھر جھوٹ بولے!"

"جوانی قسم، سچ کہہ رہا ہوں!"

"پھر اب تک کہاں غائب تھے؟"

"تم میری دشمن بنی ہوئی تھیں۔ میں دور دور رہتا تھا، مجھے کیا معلوم تھا، تمہارے دل میں بھی میری محبت ہے!"

"یہ تو تمھیں اب معلوم ہوا، لیکن جب تم میرے کمرے میں آئے تھے، جب تو تم مجھے اپنا دشمن ہی سمجھ رہے تھے!"

"ہاں!"

"پھر کیوں آئے؟"

"بدلہ لینے!"

"بدلہ کاہے کا!"

"میں نے سوچا بہت اچھل کود رہی ہو، ماہرو کے بارے میں چلو تمھیں بھی ماہرو جیسا بنادوں، پھر خاموش ہوجاؤ گی، ہمیشہ کے لئے

"میں تو ابھی پوچھکر رہوں گی"

"اور اگر میں نہ بتاؤں ابھی تو"

"تو میں خفا ہو جاؤں گی، بات بھی نہیں کروں گی تم سے!"

وہ مسکرایا، اس کی آنکھوں سے شعلوں کی لپٹیں نکلنے لگیں۔ وہ کچھ اور میرے قریب آگیا، اس کے ہاتھ میں بڑی دیر سے میرا ہاتھ تھا، اس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا، اور رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"بس سمجھ جاؤ!"

"اے واہ کیا سمجھ جاؤں؟ کچھ کہو بھی تو!"

"بڑی مورکھ ہو تم!"

"یہی سہی! لیکن میں تو سُن کر ہی رہوں گی!"

"بتا تو دیا!"

"میں نے کچھ بھی نہیں سنا!"

"بس یہی بات ..... !"

جو کچھ میں نے دوسروں سے سنا تھا، آج خود مختار سے اس کی تصدیق ہوگئی، اس کی یہ باتیں سن کر میں دنگ رہ گئی، اس نے کہا

"سنتی ہو!"

"ہاں سُن رہی ہوں، کہو!"

"تمہارے کہنے سے میں نے بتا تو دیا ہے، لیکن ایک بات

کہے دیتا ہوں ..... !"

"تو کہو نا!"

"اگر یہ بات کبھی تمہارے منہ سے نکلی تو یہ ہے اور تم ہو!"

"یہ ہے"! کہتے ہی اس نے اپنی کمر سے بڑا لمبا چمکتا ہوا چاقو نکال لیا، اتنا تیز معلوم ہو رہا تھا کہ پتھر پر بھی چلا دو تو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھدے اُسے، چاقو دیکھکر میرے اوسان جاتے رہے لرزہ طاری ہوگیا میرے اوپر، میں نے بڑی مشکل سے اپنے تئیں سنبھال کر کہا

"مجھے مار ڈالوگے؟"

اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کڑے تیور کے ساتھ کہا،

"ہاں تمہیں بھی!"

اتنی دیر تک میں نے اسے باتوں میں بہلائے رکھا، اور سوچتی رہی کہ کس طرح اس موئے آدم خور سے نجات پاؤں۔ لیکن یہ چمکتا ہوا بڑا سا چاقو دیکھکر تو نجات کا دروازہ بند ہوتا مجھے نظر آیا۔ مجھے یقین ہوگیا، اب میں اس کے چنگل سے بچ نہیں سکتی، اگر ذرا بھی میں نے مزاحمت کی تو یہ مار ہی ڈالے گا مجھے، آج مجھے اندازہ ہوا کہ آدمی کو اپنی جان کتنی پیاری ہوتی ہے، خودکشی کی زہر کھا لینے کی، ڈوب مرنے کی، گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی لگا لینے کی اسکیمیں کئی مرتبہ میں نے بنائیں، لیکن کسی نہ کسی مصلحت سے ٹال

اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، کچھ غصہ کی کیفیت پیدا ہو گئی،
لیکن اس نے ضبط کیا، مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں؟ آج کیوں نہیں؟"

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

"صرف آج ہی نہیں بلکہ ابھی کئی دن تک نہیں!"

یہ کہکر میں نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا، وہ ذرا آرام ہوا،
اب کی سچ مچ مسکرایا، بڑی ملائمت سے اس نے کہا۔

"بتاؤ تو آخر کیوں؟"

میں نے ہولے سے اس کے گال پر ایک چپت لگائی اور کہا

"بڑے بے وقوف ہو تم، کچھ سمجھتے ہی نہیں، کوئی بھاگی جا رہی ہوں
میں، کسی کی مجبوری کا بھی تو خیال کرو!"

اب وہ میرے قابو میں آچکا تھا، راضی ہو گیا، کہنے لگا۔

"اچھا بھئی، جو تم کہو گی، مجھے منظور ہے!"

"سچ کہتے ہو؟"

"بالکل سچ!"

"تو میری ایک شرط بھی ہے!"

"وہ بھی کہہ ڈالو!"

"اگر تم مجھے اپنا بنانا چاہتے ہو، تو تمہیں وہ کھیل بند کرنا پڑے گا
جس کے تم اتنے دنوں سے عادی ہو!"

گئی، اس وقت تو میں یہی سمجھتی تھی کہ میرا دل مضبوط ہے جب چاہوں مر سکتی
ہوں، لیکن فی الحال کسی نہ کسی وجہ سے مرنا مناسب نہیں ہے، اب معلوم
ہوا، وجہ ایک ہی تھی، میں مرنا نہیں چاہتی تھی، اپنی بزدلی پر مصلحت
کی شکر لپیٹ لیتی تھی، اور اپنے دل کو تسکین دے لیتی تھی
جیسے شکر میں لپٹی ہوئی کونین کو کوئی یہ سمجھ کر کھا لے، کہ یہ
چاکلیٹ ہے!

بخار کی بے تابی اب بڑھتی جا رہی تھی، میں دیکھ رہی تھی،
اب ضبط کا رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا تھا، وہ بے قابو
ہو کر دیوانہ وار میری طرف بڑھ رہا تھا، اور مجھے دبوچ کر اپنے دل
میں رکھ لینا چاہتا تھا، میں اسے میٹھی باتوں میں لگا لگا کر روک رہی تھی،
ایک کمزور بند امنڈتے ہوئے سیلاب کے ریلے کو زیادہ دیر تک
نہیں روک سکتا، اسی طرح میری لبھانے اور پرچانے والی باتیں اب
زیادہ دیر تک اسے قابو میں نہیں رکھ سکتی تھیں،

جب اس کی بے تابی بہت بڑھ گئی، تو میں نے اس سے
کہا۔

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میں بھی تمہیں چاہتی ہوں، تمہیں
میری ایک بات ماننی پڑے گی!"

"ضرور مانوں گا کہہ کے تو دیکھ لو!"

"جو کچھ تم چاہتے ہو وہ ضرور ہو گا، لیکن آج نہیں!"

"یعنی!"

"ماہرو کی طرف رُخ بھی نہ کرنا"

"نہیں کروں گا!"

"پرویں سے بھی بات نہ کرنا"

"بات بھی نہیں کروں گا اس سے!"

"اور ..... جی کڑا کر کے سنو!"

"سیٹھ صاحب سے بھی تمہیں اپنی ہنسی دل لگی کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"اگر یہ نہیں ہو سکتا تو تم میرے قریب بھی نہیں آ سکتے، میں تو تمہارے چاقو سے بھی نہیں ڈرتی، تو مجھے مار ڈالو ابھی اسی وقت!"

اب وہ بالکل میرے جال میں پھنس چکا تھا، اس نے کہا۔

"اچھا مان لی تمہاری شرط، لیکن یہ تو سوچو، بڈھا اگر بگڑ گیا۔ تو میری نوکری رہے گی؟ پھر میں تم سے کیسے ملوں گا؟ تمہیں میں کیسے پاؤں گا؟"

میں نے کہا۔

بڑے بے شرم اور نکھٹو ہو تم، تمہیں شرم نہیں آتی، اس طرح کی آمدنی پر بسر کرتے، میں تمہارے لئے اس محل کو چھوڑ کر جھونپڑی میں رہ سکتی ہوں، اچھے اچھے کھانے

چھوڑ کر چوٹی بھوسی پر گذر کر سکتی ہوں، پھٹے پُرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں بسر کر سکتی ہوں۔ مگر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ محنت اور حق حلال کی کمائی مجھے کھلاؤ، تم مزدوری کرو روپیہ بارہ آنے روز لاؤ، وہی ہمارا سب سے بڑا خزانہ ہوگا!"

میرے یہ الفاظ سُن کر اس میں ایک نئی اُمنگ اور ترنگ پیدا ہوگئی، اس کی سوئی ہوئی ہمتِ مردانہ جاگ اٹھی، میں نے محسوس کیا کہ وہ خود اپنے سے شرما رہا ہے، میں نے ایک تازیانہ اور لگایا،

"میں سیٹھ صاحب کو چھوڑ دوں گی، تمہارے لئے، وہ میرا کچھ نہیں کر سکتے، ان کی کمر دبی ہوئی ہے، مجھ سے بھی اور تم سے بھی، لیکن یاد رکھو، عورت مرد سے محبت کرتی ہے، بھڑوے اور رنڈے سے نہیں۔ خدا نے تمہیں مرد بنایا ہے، حسن دیا ہے، ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، تم عورت پر اس کے دل پر راج کر سکتے ہو، لیکن جب میں تمہاری یہ عادتیں سوچتی ہوں، تو میری محبت دب جاتی ہے اور نفرت ابھر آتی ہے، میں تم سے نفرت کرنے لگتی ہوں، حالانکہ جب سے تمہیں دیکھا ہے، میرے دل میں تمہاری محبت بسی ہوئی ہے!"

اب وہ نشۂ مردانہ سے چور چور تھا، اس نے کہا

"جو تم کہہ رہی ہو، وہی ہوگا، ذرا بھی اگر اکڑا یہ بوڑھا، تو ٹیٹوا ہی دبا دوں گا سالے کا!"

میں نے ایک شراب کا گلاس اُسے اور پلایا۔

" اگر اس طرح رہو گے، تو میں لونڈی بن جاؤں گی تمہاری، میرا دل ایک مرد کو ڈھونڈ ھتا تھا، آج مجھے وہ مل گیا، اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے ——— ! "

شراب کے اس گلاس نے بدمست کر دیا، وہ مستی سے جھومتا ہوا اٹھا، اس نے اپنے ہاتھ سے کمرے کی سٹکنی کھولی، جسے اس نے میرے پاس آتے وقت اندر سے بند کر لیا تھا، اور جاتے جاتے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا،

" اچھا تو پکی رہی ! "

میں نے کہا۔

" مجھ سے کیا پوچھتے ہو، اپنے دل سے پوچھو ! "

" دھوکا تو نہ دو گی ! "

" عورت جس سے محبت کرتی ہے اسے کبھی دھوکا نہیں دیتی ! "

" آخر وقت تک ساتھ دو گی ؟ "

" عورت جس کا ہاتھ ایک مرتبہ پکڑتی ہے، مرنے کے بعد بھی اسے نہیں چھوڑتی ! "

جاتے جاتے اس نے مجھے اپنے سینے سے لگانا چاہا، لیکن اب میں اس پر حاوی ہو چکی تھی، میں نے کہا۔

" یہ بھی نہیں ہو سکتا، میں ضرور تم سے محبت کرتی ہوں، لیکن ابھی تم میری محبت کے مستحق نہیں ہو۔ میری محبت کے تم اسی وقت مستحق

ہو گے، جب تم وہ بن جاؤ گے، جو میں تمہیں بنانا چاہتی ہوں ! "

وہ ایک مردانہ عزم کے ساتھ مسکراتا ہوا چلا گیا، اور میں اپنے پلنگ پر آکر لیٹ گئی !

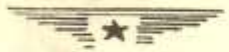

باب ۲۹
حیرت انگیز

صبح جب میں سو کر اٹھی تو مطمئن تھی۔ اور کسی حد تک خوش بھی۔ اطمینان یہ تھا کہ اب ایک عرصہ تک نجتاور بدنیتی سے میری طرف ہاتھ نہیں بڑھائے گا، اور تربیت گاہ بھی اس کے حملوں سے محفوظ رہے گی، خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اب میرے قبضے میں تھا، جو ناچ میں چاہتی نچا سکتی تھی اسے، اب میں بکری کی طرح مجبور نہیں تھی، جو شیر کے سامنے بے بس اور مجبور ہوتی ہے، بلکہ سرکس کی رنگ ماسٹر تھی جو شیر کو کوڑے لگاتا ہے، اور اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے۔

دوسرے روز کرشنا کماری ملنے آئیں، بیچاری دو ہی دن میں بہت جھک گئی تھیں۔ مارے غصہ اور پریشانی کے، میں نے بڑے تپاک سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ آکر چپ چاپ بیٹھ گئیں میرے پاس۔

میں نے کہا

"بہت سست ہو کیا بات ہے؟"

"انجام سوچ رہی ہوں اپنا"

"کوئی نئی بات ہوئی!"

"نئی بات کیا ہوتی؟ وہی پرانا دکھڑا ہے!"

"تربیت گاہ کا؟ نجتاور کا؟"

"اور کیا؟"

"اب تم ذرا بھی فکر نہ کرو!"

"کیوں؟"

"میں نے سب بندوبست کر لیا ہے!"

"مجھے بھی تو بتاؤ!"

"بتا تو رہی ہوں اب تمہاری تربیت گاہ کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا"

"تربیت گاہ گئی بھاڑ میں، میں تو اپنی سوچ رہی ہوں!"

"کیا سوچ رہی ہو! میں بھی تو سنوں!"

"وہ موئی پروین مسکراتی ہوئی۔ نکلتی ہے میرے کمرے کے سامنے سے ——!"

"تو؟"

"فوراً مجھے یاد آجاتا ہے، یہ سمجھتی ہے دربان سے میرے تعلقات

ہیں، اور وہ رات کو میرے پاس آیا کرتا ہے!"

مجھے ہنسی آگئی، وہ بگڑ گئیں،

"تم تو ہنس رہی ہو واہ!"

"تو کیا روؤں!"

"ہنسنے کی ایسی کیا بات ہوئی!"

"پروین کی بات لئے ہوئے ہو تم، ارے بھئی وہ تو بدمعاش ہی ہے، وہ تمہارے سفید چونڈے میں کالک لگائے گی اور تم لگوا لوگی؟ اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے، کوئی بھی یقین کر سکتا ہے، کہ اس بڑھاپے میں تم کسی کا پہلو گرم کروگی؟ —— تم کوئی سیٹھ صاحب تو ہو نہیں کہ بڑھاپے میں جوانوں سے کھیلو، تم عورت ہو اور وہ بھی غریب، جوان تو جوان کوئی بوڑھا بھی نہیں تھوکے گا تم پر!"

"لیکن وہ کہتی جو پھرتی ہے!"

"اس کے بکنے سے کیا ہوتا ہے؟ مجھے تو وہ بھی کہہ رہی ہے امرنجاؤ نواز چکا ہے، مجھے تو غصہ کے بجائے ہنسی آگئی، یہ تو وہی مثل ہوئی، بی بی کو لونڈی کہا، وہ ہنس دیں، لونڈی کو لونڈی کہا، وہ رو دی، میں برا اس وقت مانتی جب اس کی بات میں سچائی ہوتی!"

انھوں نے ایک زوردار جمائی لیتے ہوئے کہا،

"ہم تمہارا سا دل کہاں سے لائیں بھئی!"

"اتنی معمولی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی!"

میری بات کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آگئی، اب ان کے چہرے پر افسردگی نہیں تھی، جو کچھ روز پہلے تھی،

کرشنا کے جانے کے بعد بیٹھے بیٹھے میری طبیعت بگڑی، میں بالا خانے پر جانے لگی، وہاں لائبریری تھی، سوچا کوئی کتاب پڑھ کر جی بہلاؤں گی، جب سیٹھ صاحب کے سامنے سے گزری، تو میں نے دیکھا کہ وہ اور بختاور بیٹھے ہوئے ہیں، اور منشی بیٹھا ہوا کچھ ہدایتیں لے رہا ہے، سیٹھ صاحب سے!

میں بے جھجک اندر چلی گئی، رات بھر میں کافی بدل چکی تھی، اب نہ میرے چہرے پر غم کا کوئی نشان تھا، نہ پریشانی کی بے رونقی چہرہ پھول کی طرح کھلا جا رہا تھا، اور باتیں خواہ مخواہ ہنسی مذاق کی سوجھ رہی تھیں، میں اندر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی،

منشی جی کے جانے کے بعد سیٹھ صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا، میں نے ان سے مسکراتے ہوئے کہا،

"کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں یونہی اپنے دفتر کا کام!"

"ہر وقت کام کام کام!"

اس انداز گفتگو سے وہ عرصہ ہوا محروم ہو چکے تھے، انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، مسکرائے کہنے لگے،

"اچھا نہیں کرتا کام، کہو کیا ہے؟"

"ہمارا تو سینما دیکھنے کو جی چاہ رہا ہے آج!"

"چلیں گے کسی روز!"

"کسی روز کب؟ میں تو آج جاؤں گی!"

میری سیٹھ صاحب کی لڑائی تھی، بول چال تقریباً بند تھی، وہ مجھے دھمکیاں دے چکے تھے، میں انھیں دھمکیاں دے چکی تھی، وہ میرے خون کے پیاسے تھے، میں ان کے خون کی پیاسی تھی، وہ مجھ سے بے تعلق اور دست بردار ہونے کا میرے سامنے اقرار کر چکے تھے میں ان سے بے تعلق اور دست بردار ہو جانے کا ان سے وعدہ کر چکی تھی وہ اس کے منتظر تھے کہ میں آئی ہوں تو کوئی نیا ہنگامہ کھڑا کروں گی، بختاور کے خلاف کوئی بات کہوں گی، خود سیٹھ صاحب کی ذات پر نکتہ چینیاں کروں گی، تربیت گاہ کا، ماہرو کا، کرشنا کماری کا کوئی تصفیہ چھیڑوں گی، لیکن یہ کچھ نہ ہوا، بلکہ میں ان سے گھل مل کر باتیں کرنے لگی جیسے وہ میرے عاشق ہیں اور میں ان کی معشوق، جیسے میرے ان کے درمیان کوئی جھگڑا تھا ہی نہیں، جیسے وہ میری ہر بات مان لیتے ہیں اور میں جو چاہوں ان سے کرا سکتی ہوں، میری یہ تبدیلی دیکھ کر وہ حیران ہوئے، کچھ خوشی، کچھ تعجب، اور کچھ جستجو کی کیفیت ان پر طاری ہوئی، لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکے، انھوں نے بڑی ملائمت سے کہا،

"توکل پر رکھو پروگرام!"

میں نے مچلتے ہوئے کہا،

"کل بھی اور آج بھی، ہم تو دونوں دن دیکھیں گے سینما!"

"لیکن آج مجھے بہت سے کام ہیں، ایک دعوت میں شرکت کرنی ہے، ایک جلسہ میں جانا ہے، آج میں کسی طرح وقت نہیں نکال سکتا، پہلے سے وعدہ کر چکا ہوں!"

"تو کل آپ کے ساتھ جائیں گے اور آج.....!"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے کل میرے ساتھ چلنا، آج اکیلی ہو آؤ!"

"اکیلی کیوں ہو آؤں؟ بختاور کے ساتھ چلی جاؤں گی!"

سیٹھ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی، شاید اتنی حیرت انھیں کبھی نہ ہوئی ہوگی، انھوں نے بڑی حیران نظروں سے مجھے دیکھا، پھر وہی حیران نظریں بختاور پر جما دیں، کہنے لگے،

"بختاور کے ساتھ جاؤ گی؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، شوق سے جاؤ!"

"کہہ دیجئے، بختاور کو بھی کام ہے، اسے بھی جلسہ میں جانا ہے، دعوت میں شرکت کرنی ہے!"

سیٹھ صاحب بھی ہنسنے لگے اور بختاور بھی! میں اٹھی جاتے جاتے میں نے بختاور سے کہا،

"کہیں غائب نہ ہو جانا، سینما چلنا ہے!"

یہ کہکر میں لائبریری چلی گئی، اور ایک کتاب پڑھنے لگی بیٹھ کر!

رات کو ۹ بجے کے قریب میں نے نجتاور سے کہا۔

"گاڑی لے آؤ، اب چلیں"۔

"ابھی سے؟ ابھی تو ۹ بجے ہیں کھیل تو دس بجے شروع ہوگا!"

میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھکر کہا۔

"تمھیں کیا؟ جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو، ذرا ادھر ادھر گھومیں گے ہوا کھائیں گے، پھر وقت پر سینما ہاؤس چلے جائیں گے"

"تھوڑی دیر میں نجتاور واپس آیا، اس نے کہا گاڑی لگادی ہے، دروازہ پر چلئے!"

اعلیٰ درجہ کے کپڑے صندوق میں سڑ رہے تھے، پٹے ہوئے میرا دل مرچکا تھا، کوئی رغبت اور خواہش باقی ہی نہیں رہ گئی تھی لیکن آج میں نے ایک بڑی قیمتی ساڑھی زیب بدن کی نہایت اعلیٰ درجہ کا ریشمی بلاؤز پہنا۔ معلوم ہوتا تھا آب کار رواں کا ہے، میری باہیں اس کے اندر سے اس طرح جھلک رہی تھیں، جیسے کسی تالاب کی تہہ سے اچھل کر مچھلی سطح سے ذرا نیچے نیچے تیر رہی ہو، لپ اسٹک اور پاؤڈر نے میرے حسن کو کچھ اور نکھار دیا تھا، غرض میں ہر طرح سے مسلح ہوکر اس کے ہمراہ باہر نکلی، گھر کے نوکر بھی یہ منظر دیکھ کر حیران تھے، کہاں تو میری نجتاور سے وہ نفرت اور کہاں یہ دوستی؟ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور میں بنی سنوری اگلی نشست پر اس کے پہلو سے پہلو ملائے بیٹھی تھی، جب تربیت گاہ کے سامنے سے گاڑی گزری تو میں نے دیکھا، کہ پردیں

دروازہ پر کھڑی ہوئی دربان سے کچھ کہہ رہی تھی، میں اسے دیکھتی چلی گئی اس نے پہلے نجتاور کو دیکھا، اور پھر مجھے دیکھا، اور نہ جانے کب تک دیکھتی رہی!

میں نے نجتاور سے کہا،

"سینما میں تو ابھی دیر ہے، چکر کے راستہ سے سمندر کے کنارے کنارے چلو، اس نے گاڑی کا رخ اسی طرف موڑ دیا، اور وہ ہوا سے باتیں کرتی ہوئی چل کھڑی ہوئی،

جب ساحل کے قریب گاڑی پہونچی، میں نے کہا، اب رفتار ذرا دھیمی کرو، بلکہ ذرا آگے چل کر روک لو، کچھ دیر یہیں کا نظارہ کریں گے پھر ٹھیک پونے دس بجے سینما چلے چلیں گے،

ذرا آگے جاکر اس نے گاڑی روک لی، میں نے کہا، اتریں گے نہیں یہیں بیٹھے بیٹھے گاڑی پر باتیں کریں گے،

ہم دونوں خاموش تھے، نہ کچھ وہ بول رہا تھا نہ میں، چودہویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، تارے جھلملا رہے تھے، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، سمندر کی پرشور اور پرشور لہریں ساحل سے آآکر سر ٹکرا رہی تھیں، فضا پر ایک عجیب سناٹا طاری تھا ہمارے آگے پیچھے کچھ فاصلے پر چند گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، یہ تفریح گاہ رات کو بلکہ رات بھر محبت کی تفریح گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی، محبت کرنے والے تماشبین جوڑے اپنی اپنی موٹروں میں آتے تھے اور

موٹروں کے اندر بیٹھ کر تازہ ہوا بھی کھاتے تھے، اور چاہ کا کھیل بھی کھیلتے تھے، دو چار سپاہی بھی اس وسیع سڑک پر گشت کر رہے تھے، مگر اس لئے نہیں کہ جھانک جھانک کر دیکھیں، کہ اس سنسان مقام پر ان کی خاموش کھڑی ہوئی گاڑیوں میں رات گئے تک کیا ہوتا رہتا ہے، اتنی ہمت ان میں کہاں تھی، اور شاید قانون بھی اس کی اجازت انھیں نہیں دیتا تھا، ان کا کام صرف یہ تھا کہ سڑک پر گشت کرتے رہیں، بلکہ ان عصمت کے ڈاکوؤں اور آبرو کے چوروں کی حفاظت کرتے رہیں، اور انھیں یہ اطمینان دلاتے رہیں، کہ تم اپنا کام کئے جاؤ تمہارے پاس پرندہ بھی پر نہیں پھٹک سکتا، ہاں اگر کوئی پاپیادہ شخص رات کے اس سناٹے میں انھیں نظر آجائے، تو ظاہر ہے آوارہ گردی کے الزام سے نہیں بچ سکتا تھا، ضرور اس کی گرفت ہوتی اور پہنچا دیا جاتا حوالات میں،

بڑی رومان انگیز فضا تھی میں نے بختاور کے کہنی ماری، وہ چونک پڑا، میں نے کہا۔

"کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں!"

"پروین یاد آ رہی تھی؟"

"توبہ کرو!"

"تو ماہرو یاد آ رہی ہوگی"

"بالکل نہیں!"

"ہاں ٹھیک —— سیٹھ صاحب یاد آ رہے ہوں گے تمہیں،

کیوں کیسی کہی —— ؟"

وہ ہنسنے لگا۔ اس نے کہا،

"تم یاد آ رہی تھیں!"

"میں —— !"

"ہاں تم!"

"میں تو تمہارے پاس بیٹھی تمہارے دل کی دھڑکن تک سُن رہی ہوں مجھ سے باتیں کرنے کی بجائے مجھے یاد کیوں کر رہے تھے؟"

اس نے پہلو بدل کر کہا۔

"ایک وہ لوگ ہیں کہ جو اپنی گاڑی میں ہم سے ذرا فاصلہ پر زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ پاس پاس بیٹھے ہیں۔ لیکن کتنے دُور ہیں!"

"سچ کہتے ہو، لیکن ہم دور رہ کر بھی جتنے قریب ہیں، وہ پاس بیٹھ کر بہت دور ہیں!"

"ہو گا یہ بھی سچ!"

یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور للچائی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا، میں نے کہا،

"میری محبت میں تمہیں شک ہے کچھ!"

"بالکل نہیں، اگر تھا تو وہ بھی آج دور ہوگیا!"

"تم ہی سمجھ لو ——— مجھے اگر محبت نہ ہوتی، تو سیٹھ صاحب کی جیب سے تمہیں کیوں نکال لاتی، منہ دیکھتے رہ گئے میرا!"

"ہاں بھئی سچ کہوں! مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی تھی، اس وقت تمہارا ہیاؤ کیسے پڑا ان سے کہنے کا کہ نجتاور کے ساتھ جاؤں گی سینما دیکھنے!"

"میرے ہیاؤ کو تم کیا کہتے ہو؟ آگے چل کر دیکھنا میرا ہیاؤ!"

یہ باتیں کرتے کرتے میری نظر گھڑی پر پڑی، دس بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے، میں نے کہا۔ گاڑی اسٹارٹ کرو، بہت دیر ہوگئی دس بج رہے ہیں!"

ہم لوگ عین وقت پر سینما پہونچے نشستیں محفوظ کرائی تھیں، کوئی دقت نہیں ہوئی، فوراً جاکر اپنے بکس میں بیٹھ گئے۔

انٹرول کے دوران میں پھر ہم دونوں کی باتیں چھڑ گئیں، نجتاور نے مجھ سے کہا،

"اگر سیٹھ صاحب نے کچھ بھانپ لیا تو؟"

میں نے کہا:-

"پھر تم نے بزدلی کی باتیں کیں؟ بھانپ لیں گے تو کیا کرلیں گے؟ جب میں نہیں ڈرتی، تو تم کیوں مرے جارہے ہو ڈر کے مارے، صاف صاف کیوں نہیں کہتے پرویں سے ڈر رہا ہوں، وہ کھڑی تو تھی دروازے پر اور دیکھ بھی رہی تھی، گھور گھور کر تمہیں!"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا، میں تو یونہی ایک بات کہہ رہا تھا!"

"اچھی بات کہی تم نے! دل جلا کر راکھ کردیا، اور ان کی یوں ہی ایک بات تھی واہ!"

بے چارہ سٹ پٹا کر خاموش ہوگیا، اتنے میں ہاؤس پھر تاریک ہوگیا، اور کھیل شروع ہوگیا ——— اندھیرے میں اور پاپ میں بڑی پرانی دوستی ہے، میں تھیٹر کو اس لئے پسند کرتی ہوں، کہ وہ روشنی میں دکھایا جاتا ہے، اور سینما سے اس لئے گھبراتی ہوں کہ وہ اندھیرے میں دکھایا جاتا ہے!

میں قہقہہ مار کر ہنسا، میں نے کہا،

"شیریں تمہاری باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں، کیا بات پیدا کی ہے، لیکن برا نہ ماننا پہلے میں جمشید سے کھٹکا تھا، اور اب یہ تمہارا یہ نجتاور مجھے اپنا رقیب روسیاہ دکھائی دے رہا ہے ——— کہیں مل جائے تو کمبخت کے ٹکڑے کردوں،

"اے واہ! یہ بھی اچھی ادا ہے، جس مرد کا مجھ سے ذکر سنا اس کے دشمن ہوگئے، کہیں تم پاگل نہ ہوجاؤ!"

"کہیں پاگل نہ ہوجاؤں کے کیا معنے، ارے بھئی میں ہوں ہی تمہارا دیوانہ ———!"

شیریں نے ایک ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا، جس میں زہر بھی تھا، اور تریاق بھی، بس اسی نگاہ پر آج کی صحبت شب تمام ہوگئی۔

باب ۳۰
کھٹک

چند روز تو سیٹھ صاحب میری اور نجتاور کی رسم و راہ سے بہت خوش رہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کی یہ خوشی کم ہوتی گئی، وہ اب کچھ کھٹکنے لگے تھے، ہم دونوں کے ربط و ضبط کو وہ بُری طرح محسوس کر رہے تھے، لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، کیا کہتے کس منہ سے کہتے نہ وہ نجتاور کو ناراض کر سکتے تھے، نہ مجھ پر اعتراض کر سکتے تھے، دل ہی دل میں جل کر رہتے تھے ؎

دل کو روؤں، یا جگر کو میر
میری دونوں سے آشنائی تھی!

پہلے وہ ہم دونوں کو گھل مل کر باتیں کرتے یا کہیں آتے جاتے دیکھتے تھے، تو بہت خوش ہوتے تھے، جیسے تلے اوپر کے لڑنے والے

بچوں کا ملاپ دیکھکر کوئی بوڑھی ماں خوش ہوتی ہے، لیکن اب وہ اس میل جول سے اس طرح کھٹک رہے تھے، جیسے ایک پُرانا عاشق اپنے معشوق کو کسی نئے آدمی کے ساتھ پینگ بڑھاتے دیکھکر اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو جائے، اب ان کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے صرف ہنسی آتی تھی، ترس ذرا بھی نہیں آتا تھا،

رات کے کوئی ساڑھے نو بجے ہوں گے، آج بھی ہمارا سینما کا پروگرام تھا، میں اپنے کمرے میں آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی آرائش کر رہی تھی۔ آج سیٹھ صاحب تشریف لائے، اور خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

جب میں اپنے بالوں کو ٹھیک کر چکی، اور گالوں پر سرخی لگا چکی تو ان کی طرف متوجہ ہوئی، پوچھنے لگے،

"کہاں جا رہی ہو؟"

میں نے بڑی بے تکلفی سے کہا

"سینما!"

وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر انہوں نے کہا

"اکیلی جا رہی ہو!"

میں نے تیوری چڑھا کر کہا

"اکیلی کیوں جاتی؟ نجتاور جائے گا میرے ساتھ!"

"اب تو بڑا ربط و ضبط ہو گیا ہے تم دونوں میں"

"تو آپ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں اس کے ساتھ نہ جایا کروں، نہیں جاؤں گی آج سے!"

یہ کہہ کر میں لباس بدلنے لگی، انھوں نے گھبرا کر کہا،

"ارے یہ کیا کر رہی ہو؟ جاؤ نا، میں نے تو ایک بات یونہی احتیاطاً کہہ دی تھی، یہ مطلب کب تھا کہ تم جانا ملتوی کر دو!"

"نہیں اب میں نہیں جاؤں گی!"

"آخر کیوں؟"

"آپ کو بُرا لگتا ہے!"

"بالکل بُرا نہیں لگتا ہے، تم شوق سے جاؤ!"

کپڑے پھر سے درست کرتے ہوئے کہا

"جاؤں؟"

"ہاں بھئی کہہ تو رہا ہوں!"

میں نے اپنے اوپر خفیف سی وحشت طاری کر لی، اور ان سے گویا ہوئی۔

"اور اگر آپ خفا ہو گئے تو!"

"نہیں میں خفا نہیں ہوں گا"

میں نے سیٹھ صاحب پر ایک چھینٹا اور لگایا، میں نے کہا

"اب تو نجا ورسنبھل گیا ہے بے چارہ!"

کہنے لگے ذرا مسکراتے ہوئے!

میں مسکرائی، میں نے آئینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،
"ہاں کچھ اعتراض ہے آپ کو"؟
وہ ذرا جھینپ گئے، کہنے لگے۔
"نہیں تو ——— اعتراض کی کیا وجہ ہوسکتی ہے!"
"میں نے کہا۔ شاید!"
"نہیں، نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا"!
"پھر کیا مطلب تھا آپ کا!"
"کچھ نہیں یونہی پوچھا تھا!"
میں نے اپنے بلاؤز کی شکن درست کرتے ہوئے کہا
"اب نجتاور بھی برا ہوگیا؟"
"یہ کون کہہ رہا ہے!"
"جب تک میں اس کی دشمن تھی، وہ دنیا کا سب سے اچھا آدمی تھا، جب سے میں نے اس سے دوستی کی ہے، اس میں بھی کیڑے پڑگئے واہ بھئی ——!"
"تم تو آج ہوا سے لڑ رہی ہو، میرا مطلب یہ کب تھا؟"
"خوب سمجھتی ہوں میں مطلب، ہوا سے کیوں لڑوں گی؟"
"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ذرا احتیاط رہے!"
"تو میں کون سے بے احتیاطی کرتی ہوں، ذرا بتایئے تو!"
"پھر بھی ذرا خیال چاہیئے!"

سیٹھ صاحب جل گئے، کہنے لگے؛
"تم اس کا اتنا پارٹ لیتی ہو؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا!"
"میں کیوں پارٹ لوں گی کسی کا؟ میں تو سچی بات کہہ رہی ہوں! آپ کو یہ بھی ناگوار ہو تو کہیئے؟"
انھیں اور غصہ آگیا، کہنے لگے "یہ بات بات میں تم میری ناگواری کا جھگڑا کیا چھیڑ دیتی ہو؟ مجھے نہیں اچھی لگتیں یہ باتیں!"
"آپ کی ناگواری کی میں پرواہ نہیں کروں گی، تو کون کرے گا —— نجتاور یا کرشنا کماری؟"
"پھر وہی بے تکی باتیں!"
اتنے میں نجتاور آگیا، میں نے کہا
"ہاں بھئی وقت ہوگیا، چلو!"
یہ کہہ کر میں جھپ سے باہر نکلی، نکلتے نکلتے میں نے ایک بار پھر سیٹھ صاحب سے پوچھا،
"تو جاؤں نا؟"
"ہاں ہاں ضرور شوق سے جاؤ!"
سیٹھ صاحب ساتھ ہی ساتھ کمرے سے باہر نکلے، بلکہ کار تک ہمیں پہنچانے آئے، میں بڑی بے پروائی کے ساتھ اگلی سیٹ پر نجتاور کے ساتھ بیٹھ گئی، میں نے محسوس کیا یہ بات بھی انھیں بہت کھلی۔
جب کار ذرا گھر سے دور نکل گئی، تو میں نے نجتاور کے کہنی ماری

"یہ کیسے ؟"

"آدمی طور طریقوں سے پہچانا جاتا ہے ——— مجھے اس سے نفرت اس لئے تھی کہ وہ تربیت گاہ کو پاپ کا گھر بنائے دے رہا تھا، لیکن اب میں نے اس سے دوستی کر لی ہے، اس لئے کہ وہ اپنے طور طریقے بدل چکا ہے، اور تربیت گاہ آنا جانا اس نے بالکل چھوڑ دیا ہے ——— !

"سچ کہہ رہی ہو تم !"

"بالکل سچ، یقین نہ ہو تو کرشنا کماری سے پوچھ لیجئے !"

"وہ بھی اب اس کی تعریف کرنے لگی ہیں ؟"

"جی ——— بہت زیادہ"

"پھر تو واقعی وہ نیک ہو گیا ہے !"

"کیا وہ کبھی بُرا بھی تھا ——— آپ سے پوچھتی ہوں !"

"تھا تو نہیں اب ہوتا جا رہا ہے !"

"وہ کس طرح ——— !"

"تمہیں نہیں معلوم ؟"

"ہاں ہاں میں سمجھ گئی !"

"کیا سمجھیں ——— تم ؟"

"یہ کہ اب وہ تربیت گاہ میں چھٹے ہوئے سانڈ کی طرح نہیں گھومتا لوگوں کو پریشان نہیں کرتا، یہ کم بُرائی ہے !"

گے ——— !"

"لیکن اس طرح بات بہت بڑھ جائے گی !"

میں نے اسے گھور کر دیکھا اور پوچھا "تو ؟"

اس نے مسکرا کر ایک نظر دوڑائی، کہنے لگا،

"تو کچھ نہیں !"

ہم دونوں ہنس پڑے،

تھوڑی دیر کے بعد نجاور نے مجھ سے کہا

"تم نے سیٹھ صاحب کو بھی ناراض کر دیا ——— اور خود بھی راضی نہیں ——— ہوتیں !"

میں نے کہا،

"اخاہ ! تو آپ کو غم ہے اپنے سیٹھ صاحب کی ناراضی کا ؟"

"غم یہ ہے کہ تم . . . . . !"

"اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے، تو تقاضہ نہ کرو، اور اگر بھروسہ نہیں ہے تو نکالو اپنا لمبا سا چاقو اور بھونک دو میرے سینے میں ابھی اسے !"

اس نے مسکرا کر ذرا تیکھے پن کے ساتھ کہا.

"ایک دفعہ کیا چاقو نکال لیا میں نے، اب جب دیکھو جب اسی کا طعنہ میں چاقو تمہارے سینہ میں بھونک سکتا ہوں بھلا ؟

"کیوں کیا ہوا ؟ کیوں نہیں بھونک سکتے ؟"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، یہ مت کہا کرو !"

موڑیں گفتگو کا آغاز میں اسی طرح کیا کرتی تھی ——————

وہ حسب معمول چونک پڑا، میں نے کہا

"کچھ سُنا تم نے؟"

"کوئی نئی بات ہے؟"

"بات تو پرانی ہے، لیکن پھر بھی نئی ہے!"

وہ مسکرایا، اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا،

"کون سی بات؟"

"سیٹھ صاحب تم سے خفا ہیں!"

"ایں؟؟"

"ہاں —————— اور مجھ سے بھی!"

"ارے یہ کیوں؟"

"وہ چلنے لگے ہیں ہم دونوں سے!"

"واقعی نئی بات ہے، کیسے معلوم ہوا؟"

"سیٹھ صاحب کی آنکھوں سے، باتوں سے، نظروں سے!"

"باتوں سے بھی؟"

"ہاں ہاں باتوں سے بھی!"

"پھر؟"

"کوئی فکر کی بات نہیں، وہ ہمیں ملنے سے منع نہیں کر سکتے تھیں نکال نہیں سکتے، لہذا ہم دونوں اطمینان سے ان کے سینہ پر کودیں

اس نے گاڑی ساحل سمندر کی طرف موڑ دی، جب ہم ساحل کے کنارے پہونچے، میں نے کہا،

"آہستہ آہستہ چلاؤ!"

"تاکہ اور دیر ہو جائے!"

"ہاں!"

وہ گاڑی آہستہ آہستہ چلانے لگا، میں نے کہا،

"اب روک لو گاڑی!"

"روک لوں؟"

"ہاں ہاں کہہ تو رہی ہوں!"

اس نے گاڑی روک لی،

میں گاڑی سے اتر پڑی، میں نے کہا

"آؤ ذرا ٹہلیں گے یہاں"

"اس وقت؟"

"یہی تو وقت ہے!"

وہ بھی اتر پڑا، اور میرے ساتھ ٹہلنے لگا، آج بھی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، اور فضا پر رومان برس رہا تھا، چلتے چلتے میں ساحل کی منڈیر پر بیٹھ گئی، میں نے کہا "تم بھی بیٹھ جاؤ اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھو"

ہم سے کچھ فاصلہ پر چند اور گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور ان

"اچھا اب نہیں کہیں گے۔ لیکن تم بھی تقاضے کر کر کے ہمیں اتنا پریشان نہ کیا کرو"

"میں تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہتا ہوں!"

"میں بھی تم سے کم بیتاب نہیں ہوں ——— ایک عورت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی، اس کے صبر و ضبط کو خطرے میں نہ ڈالو!"

اس نے مست آنکھوں سے مجھے دیکھا جیسے شرابی شراب کی بوتل کو دیکھتا ہے، میں نے تیز نظروں سے اسے گھور کر دیکھا، جیسے بلی چوہے کو دیکھتی ہے، اب سینما آچکا تھا، اور ہماری گاڑی دروازے پر کھڑی ہوئی تھی، ———

سینما دیکھ کر جب ہم گھر واپس جانے لگے، تو میں نے پھر ایک کہنی بختاور کے ماری، اس نے اچک کر کہا۔

"کیا ہے ——— ؟"

"گھر چل رہے ہو؟"

"ہاں ——— !"

"چکر کے راستے سے چلو، سمندر کے کنارے کنارے!"

"بہت دیر ہو جائے گی!"

"ہونے دو!"

"سیٹھ صاحب جو خفا ہوں گے!"

"سو تو چکے ہوں گے!"

"عشق میں اور عقل میں پرانی دشمنی ہے!"

"اسی لئے عشق ہمیشہ سر پھوڑتا رہتا ہے!"

"لیکن وہ پشیمان نہیں ہوتا!"

"عقل سے اس کی دشمنی کیوں ہے؟"

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے، اور بڑی دیر تک اسی منظر میں کھوئے رہے۔

گھڑیال نے جب تین بجائے تو ہم چونکے، بختاور نے کہا

"تین بج گئے، افوہ؟!"

میں نے کہا

"ہاں بہت دیر ہو گئی چلو!"

ہم لوگ واپس آئے، تو سیٹھ صاحب جاگ رہے تھے، میرے ساتھ میرے کمرے میں وہ بھی پہونچے، فرمانے لگے،

"بڑی دیر ہو گئی!"

"میں نے کہا۔

"ہاں ذرا سمندر کی سیر کرنے چلی گئی تھی ——— !"

شب خوابی کے کپڑے پہنتے پہنتے میں نے کہا۔ "نیند کے مارے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں" یہ سن کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے، اور میں اپنے کمرے میں لیٹ گئی سونے کے لئے!

———

کے اندر حوا کی بیٹیاں اور آدم کے بیٹے داد عیش دے رہے تھے
فضا خاموش، سمندر متلاطم، میں نے کہا،
"سمندر کی ان لہروں کو دیکھتے ہو؟"
وہ کہنے لگا،
"ہاں ——— میری طرح سر ٹکرا رہی ہیں، اپنا کسی
کے سنگ آستاں سے!"
وہ پھر بولا،
"اس سمندر کی گہرائی جانتی ہو تم کتنی ہے؟"
میں نے جواب دیا۔
"ہاں ——— میرے دل سے بہت کم ہے!"
میں نے پوچھا،
"یہ لہریں کیوں اٹھ رہی ہیں؟"
اس نے چاند کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"چاند کو پکڑنے کے لئے!"
"پکڑ لیں گی اسے؟"
"نہیں!"
"پھر اس ناکام کوشش سے حاصل کیا!"
"عشق کی شوریدہ سری؟"
"جو مل نہ سکے اس کے لئے سر پھوڑنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

"کیوں کیا ہوا؟"
"رات کے تین تین بجے تک سمندر کی سیر کی جاتی ہے کہیں؟"
"کچھ میں اکیلی تھوڑے تھی، اور بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، ان
میں بہت سے مرد عورت بیٹھے ہوئے سیر ہی تو کر رہے تھے!"
"وہ جیسی سیر کرتے ہیں، اور جس کے لئے رات کو جاتے ہیں، میں
خوب جانتا ہوں!"
"تو مجھے بھی بتلائیے نا؟"
"میں یہ باتیں ذرا بھی پسند نہیں کرتا!"
"کون سی باتیں؟"
"یہ آزادی، یہ آزادہ روی، اور کون سی!"
"یہ نئی بات معلوم ہوئی!"
"تم میری خاموشی سے بہت ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو!"
"یہ شکایت تو مجھے آپ سے تھی!"
"کیا مطلب؟"
"آپ کی آزادی اور آزادہ روی نے مجھے چاٹ لیا دیمک
کی طرح ———!"
"تم مجھ پر اعتراض نہیں کر سکتیں!"
"کیوں نہیں کر سکتی؟ کر سکتی ہوں لیکن کرتی نہیں!"
"کر بھی نہیں سکتی ہو؟ اور کرنا بھی نہیں چاہیئے!"

باب ۳۱
صاف صاف باتیں

رات کو دیر میں سوئی تھی، اس لئے دن چڑھے آنکھ کھلی ہیں نے دیکھا بیٹھے صاحب کا منہ کچھ پھولا ہوا ہے، کچھ خفا ہیں مجھ سے میں ان کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی، وہ اخبار پڑھ رہے تھے، مجھے دیکھکر اخبار انھوں نے الگ رکھدیا، کہنے لگے،

"آؤ بیٹھو!"

میں بیٹھ گئی، انھوں نے کہا،

"رات بہت دیر تک باہر رہیں؟"

"میں نے بتا تو دیا تھا آپ کو، ذرا سمندر کی سیر کرنے چلی گئی تھی!"

بگڑ کر بولے،

"مجھے بے وقوف بناتی ہو؟"

تھی، آپ سے، میں نہیں جاؤں گی یہاں سے!"

"تم میرا حکم نہیں مانو گی!"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"آپ اس قابل نہیں ہیں!"

"شوہر کا حکم ہر حالت میں تمھیں ماننا چاہیئے!"

"خواہ وہ آوارہ ہی کیوں نہ ہو!"

"تم کسے آوارہ کہہ رہی ہو؟"

"آپ کو اور کسے؟"

بہت غصہ آگیا، کانپنے لگے، لرزتی ہوئی آواز میں بولے

"مجھے ——— ؟!"

"ہاں آپ کو ——— !!"

وہ غصہ سے بے قابو ہوگئے، کھڑے ہوگئے، میز پر اتنی زور سے مکہ مارا کہ چوٹ آگئی ہوگی، پھر خونخوار نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا.....!

"تم حد سے بہت آگے نکل چکی ہو!"

میں نے زہر خند کرتے ہوئے کہا،

"ابھی تو میں حد تک پہونچی بھی نہیں ہوں!"

"تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو، تاکہ میں تمہاری عیاشیوں سے

"آخر کیوں؟"

"میں شوہر ہوں تم بیوی ہو!"

"گویا آپ آقا ہیں اور میں لونڈی ہوں!"

"تم بہت بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے لگی ہو، اس طرح اپنا نقصان کرو گی!"

"کیا نقصان ہو جائے گا میرا؟ آپ چھوڑ دیں گے مجھے!"

"ہاں ہو سکتا ہے یہ!"

"میں پرواہ نہیں کرتی ان باتوں کی ذرا بھی!"

"ایک آوارہ عورت کی زبان سے یہی الفاظ نکل سکتے ہیں!"

میں نے تیکھے پن سے پوچھا،

"میں آوارہ ہوں؟!"

"یقیناً!!"

"آپ نے سوچا آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

"ہاں ——— میں تمہیں آوارہ کہہ رہا ہوں!!"

"اور اگر اس کے جواب میں آپ کی آوارگی زیر بحث لاؤں، تو آپ خفا نہ ہوں گے؟"

چیخ کر بولے،

"میں نہیں سن سکتا یہ باتیں، چلی جاؤ یہاں سے!"

• زمانہ گزر گیا، جب میں آپ کا حکم مان لیتی تھی، اور ڈرتی رہتی

"آپ چپ کیوں ہیں، ان میں سے کون سی بات غلط ہے بتائیے!

وہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور میں کہہ رہی تھی،

آپ یہ سب کچھ کریں، مگر آپ بدمعاش اور آوارہ نہیں ہیں، میں کچھ نہ کروں، کلیجے پر پتھر کی سل رکھے بیٹھی رہوں، جذبات کا گلا گھونٹ دوں، دل کو قابو میں رکھوں، اپنے ناموس اور آپ کی عزت پر اپنی جوانی بھینٹ چڑھا دوں، پھر بھی میں آوارہ ہوں، بدمعاش ہوں، حد سے آگے بڑھ رہی ہوں، کیا اس لئے کہ آپ مرد ہیں، آپ کی ہر برائی اچھائی ہے، اور میں عورت ہوں، اس لئے میری اچھائی برائی بن جائے گی"۔

بڑے غور سے وہ میری باتیں سن رہے تھے، اور میں کہے جا رہی تھی۔

"اپنی پاکدامنی کی میں خود گواہ ہوں، لیکن آپ اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتے، میں نے خوشی خوشی آپ سے شادی کر لی پھر آپ کی بے بسی اور بے کسی پر ترس کھایا، اور ہر آرزو ہر تمنا، ہر جذبہ سے دست بردار ہو گئی، آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ مجھے دیوی بنا کر پوجتے، لیکن آپ نے کیا یہ کہ مجتاور کو پوجنے لگے۔ آپ نے شادی مجھ سے کی تھی، اس سے نہیں کی تھی، میں یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور اُف بھی نہ کی میں نے، میری خاموشی سے آپ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں میں کچھ نہیں کہتی، اس سے یہ نہ سمجھئے کہ میں کچھ نہیں جانتی، کچھ سمجھتی نہیں

آنکھیں بند کرلوں!"

"الزام؟"

"ہاں صرف الزام"

میں سنبھل کر بیٹھ گئی، میں نے کہا۔

"میں گنوا تی ہوں، آپ گنئے میری سچائیاں!"

"بختاور کس حیثیت سے ہے آپ کے پاس؟ یہ الزام ہے؟"

وہ خاموش رہے، میں نے کہا

"پروین اور بختاور کی آویزش کس کے ذریعے سے ہوئی کہہ دیجئے یہ بھی الزام ہے؟

وہ اب بھی خاموش تھے،

"ماہرو کو کون بھگا کر لے گیا تھا، کس نے اسے بختاور کے حوالے [illegible] تھا؟ کہہ سکتے ہیں آپ اسے الزام؟"

مجھے گھورنے لگے وہ لیکن جواب اب بھی نہ دیا، میں نے کہا

"تربیت گاہ کو قحبہ خانہ کس نے بنایا؟ اسے بھی الزام کہکر آپ ٹال دیجئے؟"

وہ کسمسائے کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن پہلو بدل کر رہ گئے،

"مجھ سے آپ نے شادی کیوں کی؟ اور اگر کی تھی، تو بیٹی اور بہن [illegible] کی طرح کیوں رکھا؟ اور اگر رکھا تو خود بھی کیوں نہ قابو میں رہے؟"

میں نے ذرا بلند آواز سے کہا۔

"مجھے بھی تو بختاور سے آپ کا ربط ضبط پسند نہیں تھا، میں بھی تو اس پر دیا کرتی تھی، مگر یاد ہے آپ کو کیا جواب دیا تھا آپ نے مجھے؟"

"میری اور بات تھی تمہاری اور ہے؟"

"کیا فرق ہے؟"

"میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، میں مرد ہوں، تم بدنام ہو جاؤگی، تم عورت ہو!"

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی!"

"کیا بات؟"

"بختاور اچھا بھی ہے اور برا بھی ہے، یہ کیونکر ممکن ہے!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ کا اور اس کا جہاں تک تعلق ہے، وہ بہت اچھا ہے، لیکن میرا اور اس کا جہاں تک تعلق ہے، وہ بے حد برا ہے آخر یہ کیا معاملہ ہے؟"

"تم بحث کر رہی ہو، میری بات کیوں نہیں مان لیتیں!"

"اچھا مان لوں گی، آپ کی بات لیکن ایک شرط ہے میری!"

"کیا؟ بتاؤ؟"

"آپ بھی بختاور سے ملنا جلنا یک قلم ترک کر دیجئے!"

"یہ نہیں ہو سکتا"

"اچھا ایک کام کیجئے!"

پہچانتی نہیں!

اب تک وہ کھڑے ہوئے تھے، اب بیٹھ گئے، میں نے کہا "میں نے کسی سے آنکھ نہیں لڑائی، کسی کی ہو نہیں رہی، کسی کے ساتھ بھاگ نہیں گئی، اپنے دل کی تسکین اور تسلی کے لئے نئے راستے نہیں ڈھونڈے پھر بھی میں آوارہ ہوں، اور آپ نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی پھر بھی آپ بڑے دہرماتما ہیں، اوتار ہیں، یہ ہے آپ کا انصاف اور یہ ہے آپ کی انسانیت!"

میں نے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔

آپ نے میری توہین کی ہے، آپ خود میرے کردار کا اقرار کر چکے ہیں، میں نے آپ کی آنکھوں میں پشیمانی کے آنسو شادی کے بعد دیکھے ہیں، ان سب باتوں کو آپ بھول گئے، اور میری برائیاں تلاش کرنا شروع کر دیں آپ نے"

اتنی دیر کے بعد انھوں نے زبان کھولی، فرمایا،

"آخر تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہتی ______________

______ آپ بتائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"مختاورے تمہارا یہ ربط و ضبط، مجھے بالکل پسند نہیں!"

"وجہ؟"

"میری مرضی!"

باب ۳۲
فیروزہ کی آمد

ایک روز صبح صبح میں دیکھتی کیا ہوں، کہ بے سان و گمان فیروزہ چلی آ رہی ہے، میں خوشی سے دیوانی ہو گئی، اٹھ کر اس سے گلے ملی، میں نے کہا،

"اری کہاں سے آ گئی؟"

"آسمان سے ٹپکی ہوں!"

"آسمان والے بھی تجھے پا جائیں تو چھوڑیں گے نہیں!"

"آنکھ بچا کے بھاگ آئی ہوں ان کی!"

"بڑی دیدہ دلیر ہو گئی ہے تو؟"

"کب نہیں تھی؟"

یہ کہہ کر اس نے زور کا قہقہہ لگایا، کہنے لگی،

"کیا کام؟"

"اس سے کہہ دیجئے، مجھ سے نہ ملا کرے!"

"یہ بھی نہیں کروں گا، میں تو تم سے کہوں گا۔"

"آپ برے بننا نہیں چاہتے مجھے برا بنانا چاہتے ہیں"

"عجیب احمقانہ باتیں کرتی ہو، وہ تمہارا ہے کون؟ اس کے برا ماننے کی تمھیں فکر کیوں ہے؟ پرواہ کیوں ہے؟ اس کا اتنا لحاظ کیوں ہے تمہیں؟"

"اور اگر یہی سوالات میں آپ سے کروں؟"

"اپنی مصلحتیں میں خوب جانتا ہوں، تم نہیں جانتیں یہ باتیں!"

"ہاں یہ باتیں تو نہیں جانتی، لیکن اپنی مصلحت میں بھی خوب سمجھتی ہوں اسی لئے آپ کی بات ماننے سے انکار کرتی ہوں ——— میں ملتی رہوں گی سخت اور سے!"

"یہ تمہارا فیصلہ ہے؟"

"اٹل فیصلہ ہے!"

"ہاں بھی تم سے ڈر لگتا ہے!"

"اے ہے کیوں؟"

"جب تمہارے پیچھے ہر وقت وہ تمہارا وظیفہ پڑھتے ہیں، تو سامنے آکر تو سجدے کرنے لگیں گے تمہیں!"

"اس ڈر سے نہیں لائی!"

"میں تار دے کر بلاتی ہوں!"

"بلا لو بھئی پر کوئی اونچ نیچ ہو تو میں نہیں جانتی!"

"اونچ نیچ کیا ہوگی، دیوانی؟"

"میں تو اب پرانی ہو چکی، تمہارے کلمہ گو وہ ہمیشہ سے ہیں، اب اگر انھوں نے دیکھ لیا تمہیں تو تم جانو!"

"چل چل مجھ سے باتیں نہ بنا!"

"سچ!"

"جھوٹی کہیں کی!"

بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے پر اسی طرح چوٹ کرتے رہے، میں نے اس سے پوچھا،

"اچھا بھئی مذاق ختم، یہ تو بتاؤ حال کیا ہے؟"

"اچھا حال ہے!"

"خوب نبھ رہی ہے تم دونوں کی؟"

"خوب ———!"

"تم کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں!"

"اب کے تم بدلی ہوئی نظر آرہی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"جو رونق اب ہے تمہارے چہرے پر، پہلے تو نہیں تھی!"

"چل ہٹ نظر کیوں لگا رہی ہے مجھے!"

وہ پھر ہنسی میں بولی،

"میں نے کہا تو یک بیک کیسی آگئی بتا تو؟"

"تم سے ملنے کو جی چاہا آگئی!"

"آہا بڑی چاہنے والی!"

"سیٹھ صاحب سے زیادہ چاہتی ہوں تجھے!"

"چل جھوٹی، بے مروت، ویسے کبھی خط بھی نہیں لکھے گئی چاہتی ہے مجھے سیٹھ صاحب سے زیادہ یہ!"

تو جھوٹ تھوڑے کہتی ہوں، امتحان لے لو میرا"

"تو اکیلی آئی ہے؟"

"ہاں ——!"

"اور جمشید؟"

"نہیں لائی انھیں؟"

"کیوں؟ کیا میں کھا جاتی تیرے انھیں!"

"میں اور وہ دو کب ہیں؟ جتنا میں تجھے چاہتی ہوں اس سے زیادہ وہ چاہتے ہیں۔ جتنا وہ چاہتے ہیں، اس سے زیادہ میں چاہتی ہوں، تجھے، تو چیز ہی ایسی ہے!"

"جمشید کو مجھ سے محبت کرتے دیکھ کر تو جلتی نہیں؟"

"بالکل نہیں ..... خوش ہوتی ہوں میں تو!"

"کیوں؟"

"جس دل میں تیری محبت ہو، وہ ناپاک اور بُرا نہیں ہو سکتا،

"یہی تو پوچھتی ہوں کیوں؟"

"تو آدمی کب ہے!"

"اچھی محبت ہے، مجھے آدمیت ہی سے خارج کر دیا"

"تو دیوی ہے دیوی!"

"معاف کرو بھئی میں باز آئی دیوی بننے سے، مجھے بس آدمی ہی رہنے دو!"

فیروزہ کے آتے ہی، میری فکر و پریشانی کے بادل چھٹ گئے وہ واقعی صرف مجھ سے ملنے آئی تھی، جمشید کا مطب خوب چل رہا تھا اسے سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی، بڑے مزے میں گزر رہی تھی ان دونوں کی، اس کے آنے کے بعد میں سیٹھ صاحب کو یک لخت بھول گئی، وہ تو مجھ سے خار کھائے ہوئے تھے، الگ الگ رہتے ہی تھے، اب صبح سے رات کے سوتے وقت تک ہمارا مشغلہ صرف

"کبھی لڑائی تو نہیں ہوئی؟"

"کبھی نہیں!"

"جمشید بہت چاہتا ہے تجھے؟"

"بہت ——— لیکن تم سے کم!"

"پھر وہی شرارت!"

"میں تو بھئی کھری اور دو ٹوک کہتی ہوں، چاہے کسی کو بھلا لگے یا بُرا ———!"

یہ کہکر اس نے اپنی باہنیں میرے گلے میں ڈال دیں، میرے منہ کے سامنے اپنا منہ کرکے اس نے میرے چہرے پر اپنی آنکھیں جماویں، کہنے لگی۔

"شیریں!"

میں نے اسے بھینچکر اور لگا لیا،

"کہو ———!"

"تم مجھے بہت یاد آتی تھیں!"

"اُوئی، کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں مجھ میں!"

"یہ کوئی مجھ سے اور میرے بعد جمشید سے پوچھے!"

میں نے ذرا دھکا دے کر اسے الگ ہٹایا۔

"آخر تو جمشید کو بیچ میں کیوں گھسیٹ لیتی ہے، میرے تیرے بیچ میں اس کا کیا ذکر؟"

"بڑی چنچل ہو تم!"

"اور نہیں تو کیا ——— اچھا ایک بات بتاؤ!"

"کون سی بات؟"

"سیٹھ صاحب کیسے ہیں؟"

"واہ ری تو دیکھ تو رہی ہے جیسے ہیں!"

"نہیں تمہارے ساتھ؟"

"یہ بھی تو دیکھ رہی ہے، پھر پوچھتی کیا ہے؟"

وہ ہنسی، اس نے کہا،

"یہ جنجال تو نے پال کیوں لیا، سچ کہتی ہوں، مجھے تو یہ ایک نظر نہیں بھاتے، جل کے کوئلہ ہو جاتی ہوں، جب انھیں تیرے پاس دیکھ لیتی ہوں، تیرا ان کا کیا جوڑ؟ کہاں بلبل کہاں کوّا؟"

"بہت زبان چلنے لگی ہے تیری، آخر میرے سیٹھ صاحب سے جلتی کیوں ہے؟ ان جیسے آدمی ملتے کہاں ہیں؟ جمشید جیسے تو درجنوں گھومتے رہتے ہیں سڑکوں پر، پکڑ لا، جب جی چاہے، اور سیٹھ صاحب وہ تو نایاب ہیں ——— اتنی بڑی نعمت سے تو جل رہی ہے ——— میں سمجھ گئی، تو ان سے نہیں جلتی مجھ سے جلتی ہے، جل کمبخت کہیں کی!"

میں بھی ہنسنے لگی اور وہ بھی، اس نے پھر پوچھا

"یہ نجتا ور کون ہے؟"

سیر و تفریح تھا، کبھی مذاق ہو رہا ہے، کبھی قصے کہے جا رہے ہیں، کبھی برج کھیلا جا رہا ہے، کبھی کیرم بورڈ پڑے ہوئے ہیں، ہم دونوں، کبھی سینما اور تھیٹر دیکھا جا رہا ہے، کبھی سمندر کے کنارے سیر و تفریح ہو رہی ہے، پتہ بھی نہ چلتا تھا، دن کب ختم ہوا، اور رات کب گئی، دن گزرتے چلے جا رہے تھے، اور ہم ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا ابھی ایک دن بھی نہیں گزرا ہے، چند گھڑیاں گزری ہوں تو گزری ہوں۔

ایک روز فیروزہ نے بڑے زور سے میرے چٹکی لی، میں بیساختہ اچھل پڑی، میں نے کہا،

"پاگل ہوئی ہے، یہ کیا؟"

"اے واہ چڑ گئیں، خود جو لیا کرتی تھیں میرے چٹکیاں، سچ کہتی ہوں، اب تک نیل پڑے ہوئے ہیں میرے!"

"تو بدلہ لینے آئی ہے تو مجھ سے!"

اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا،

"ہاں!"

اور پھر لپکی چٹکی لینے کے لئے، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا

"خبردار، ہاتھ اینٹھ دوں گی تیرا"

وہ ہنستی ہوئی بولی

"اینٹھ دو کچھ ڈرتی ہوں میں!"

اسے سنا دیا، ایک ایک بات، ایک ایک واقعہ سیٹھ صاحب کا بھی اور نجا ور کا بھی، وہ غور سے سنتی رہی، پھر اس نے کہا

"تو اب"؟

"تو اب کیا؟"

"نجا ور سے کب تک بچوگی"

"جب تک بچ سکوں گی"

"مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے موئے سے!"

"میرا دل بھی دیکھو ہاتھی سے گنے کھا رہی ہوں!"

"ہاں بھئی غضب کرتی ہو تم!"

"لیکن سوال یہ ہے کہ کب تک تم اسے بے وقوف بناؤ گی؟ آخر ایک نہ ایک دن وہ اپنا لمبا تڑنگا چمکدار چاقو پھر نکال کر تمہارے سر پر کھڑا ہوگا تب؟"

"تب کچھ نہیں مر جاؤں گی!"

"کوئی اور ترکیب نہیں ہے بچنے کی"؟

"میری سمجھ تو آتی نہیں، تمہیں معلوم ہو تو بتاؤ؟"

وہ بڑے غور سے سوچنے لگی، اتنے میں نجا ور آ گیا، میں نے اس سے کہا،

"تم بڑے نالائق ہو!"

وہ مسکرایا، اس نے کہا "کیوں؟"

"آدمی ہے !"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں !"

"پھر ؟"

"اس کی حیثیت کیا ہے ؟ یہ ہے کون ؟"

"تجھے کیا، اسے بھی چاہنے لگی ہے کیا ! لکھتی ہوں ابھی جمشید کو' آؤ لے جاؤ' اپنے بھتیجی کو، ان کی نیت ڈانواڈول ہو رہی ہے بختاور پر !"

میں روکتی ہی رہ گئی، اس نے ایک زور کی چٹکی لے ہی تو لی پیچ کہتی ہوں بلبلا گئی میں' اس نے کہا،

"پہلے تو تم اس سے بالکل الگ تھلگ رہتی ہوں' اب بہت گھلی ملی رہتی ہو' یہ کیا،"

"پہلے وہ نوکر تھا اب دوست ہے !"

"یہی تو میں پوچھ رہی تھی !"

"وہی تو میں بتا رہی ہوں، پگلی"

"نا بھئی یہ تو کوئی نئی بات ہے' میں تو کھٹک گئی تم سے !"

"یعنی ؟"

"کچھ دال میں کالا ہے !"

وہ ہنسی نہیں' سنجیدہ ہو کر مجھے دیکھنے لگی، وہ میری بچپن کی سہیلی تھی، اس کی مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں تھی، مجھے یہ برا معلوم ہوا کہ میں اپنے دل کی   اس سے کوئی بات چھپاؤں' میں نے سارا کچا چٹھا

بھ پر لٹو ہے، تجھ پر تو نہیں ہے ! قاضی جی کیوں ڈبلے، شہر کے اندیشہ میں، تجھے کیا ؟ چل اٹھ !"

اتنے میں بختاور آ گیا، کہنے لگا، "گاڑی تیار ہے چلئے" !

میں نے کہا

"چلو"

فیروزہ کا ہاتھ پکڑ کر میں نے اٹھایا، اور چل دیئے ہم دونوں سیر کو آج بھی اتفاق سے تربیت گاہ کے دروازہ پر پروین کھڑی ہوئی دربان سے کچھ باتیں کر رہی تھی' میں نے فیروزہ کو ٹھونگا مارا، اور چپکے سے کہا

"دیکھ یہی ہے پروین !"

میں بھی مسکرائی۔

"مہمان کی خاطر کرنا بھی تو نہیں جانتے تم؟"

"آخر کیا ہوا؟"

"یہ فیروزہ آئی ہوئی ہے میری لاڈلی اور چہیتی، اس کا بھی تو کچھ خیال کرو"

"تو حکم دیجئے نا!"

"جب تک یہ یہاں رہے گی، ہم روز سینما دیکھیں گے، روز سیر کو جائیں گے، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑا کرے گا، آ گیا سمجھ میں!"

(ایک تبسم کے ساتھ گردن جھکا کر) "آ گیا!"

"تو جاؤ گاڑی لے کر آؤ، اس وقت سیر کو چلیں گے، اور رات کو یاد رکھنا سینما چلنا ہے!"

وہ گاڑی لینے گیا، تو فیروزہ نے کہا،

"میں تو نہیں جاؤں گی اس موئے کے ساتھ!"

"کیوں؟"

"مجھے تو ڈر لگتا ہے بھئی!"

"میں جو ساتھ ہوں"

"ہوا کرو، میں نے تو اس کی صورت دیکھی اور خون خشک ہوا، ——— موا آدمی ہے یا.....؟

"تو ڈرتی کیوں ہے؟ مجھے دیکھ میں کب ڈرتی ہوں، پھر وہ تو

"میرے پاس تیرا رہنے کو جی نہیں چاہتا، باتیں بنانی آتی ہیں"

"یہ بات نہیں ہے!"

یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی، کہنے لگی،

"سچ میرا بس چلے تو زندگی بھر تمہارے پاس ہی رہوں، لیکن مجبوریاں بھی تو ہیں، اب جانے دو، پھر کچھ دن بعد ایک چکر لگا جاؤں گی!"

میں نے کہا

"اچھا آج تو نہیں پرسوں چلی جانا تم!"

بچوں کی طرح مچل گئی،

"میں تو آج ہی جاؤں گی"

مجھے بھی ضد آ گئی،

"اگر آج جانے کا نام لیا، تو پرسوں بھی نہیں جانے دوں گی"

بیچاری خاموش ہو گئی، میرا بڑا ہی لحاظ کرتی تھی، جو بات بھی میں کہہ دوں، کیا مجال جو ماننے سے انکار کر دے، فیروزہ کو میں نے اتنا روکا کہ آخر جمشید سے ضبط نہ ہوا، دیکھتی کیا ہوں ایک دن چلے آ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب!

وہ تو جمشید کو دیکھتے ہی نہال ہو گئی، جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا، اتنی خوش اتنی خوش کہ بیان سے باہر، جمشید کے آنے سے ہم لوگوں کی دلچسپیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا، دن رات قہقہے اور

باب ۳۳
حادثہ

بڑے مزے میں دن گزر رہے تھے، فیروزہ بار بار لاہور جانے کے لئے بستر باندھتی تھی، اور میں "ابھی نہیں" کہہ کر کھول دیتی تھی، جمشید کے خط پر خط آ رہے تھے، بیچارہ گھلا جا رہا تھا، اپنی چہیتی کے فراق میں، جتنا جتنا وہ اصرار کرتی تھی، اتنا ہی اتنا میں اسے روکتی تھی۔

"توبہ ایسی بھی جلدی کیا ہے، چلی جانا دو چار روز میں!"

"بہت دن ہو گئے اب تو!"

"تو کون سی قیامت آ گئی!"

"وہ جو گھبرا رہے ہیں، دیکھتی نہیں ہو، روز خط چلا آ رہا ہے، ایک ہی مضمون، بس فوراً آ جاؤ، کھانا وہاں کھاؤ، پانی یہاں پیو!"

بھی دل میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی، لیکن میں اسے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے میرے دل کی یہ ہوک جمشید کے دکھے دل کی ہوک ہے یا اس کا پرتو، وہ اب بہت سدھر گیا تھا، ہنسی مذاق، باتیں، تفریح، دل لگی، ہر چیز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا وہ مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، کہ اس کے دل میں میرے لئے کوئی خلش باقی ہے۔ اب کے وہ معمول سے زیادہ ضبط کر رہا تھا اور اسی ضبط نے میری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا تھا، میں سب کچھ بھانپ گئی تھی، میں بھی چپ سادھے ہوئی تھی، کیا مجال جو اس سے اپنے دل کی اتار چڑھاؤ کا اندازہ ہونے دوں، اصل بات یہ تھی کہ میں ایک خاص اصول کی عورت تھی، فیروزہ بیچ میں نہ ہوتی، تو بھی میں جمشید کو موقع نہیں دے سکتی تھی، اور اب تو فیروزہ اتنی بڑی روک تھی میرے لئے جیسے سد سکندری، وہ مجھے کتنا چاہتی تھی، میری کتنی پیاری اور وفادار سہیلی تھی، جمشید سمجھ دار آدمی تھا، وہ ان سب باتوں کو خوب سمجھتا تھا، فیروزہ سے وہ بھی محبت کرتا تھا بہت زیادہ فیروزہ چیز بھی ایسی ہی تھی کہ اس سے محبت کی جائے، وہ کسی قیمت پر بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ فیروزہ کو اس کے چال چلن پر ذرا بھی شبہ ہو، اور پھر خاص کر میرے بارے میں، وہ جانتا تھا کہ اگر فیروزہ نے یہ محسوس کر لیا، تو اس کی اور اپنی جان ایک کر دیگی

یہ وجہ تھی کہ ہمارے دل میں کھٹک اور

پیچھے ——— !

جمشید میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، وہی شوخی وہی شرارت وہی مذاق، وہی سنجیدگی کے ساتھ لوگوں کو بنانا، ایک عادت بھی تو نہیں بدلی تھی اس کی، وہ آیا، تو یہ معلوم ہوا کہ اس مدت میں کوئی بھی انقلاب نہیں آیا، زمانہ کچھ اور پیچھے ہٹ گیا، اور وہی دور پھر پلٹ آیا جب جمشید یہاں تھا، اور جان محفل بنا ہوا تھا۔

اب وہ شادی اور محبت کے بندھنوں میں جکڑ چکا تھا، فیروزہ نے اس طرح اسے پھانس لیا تھا، جیسے مکڑی اپنے جالے میں مکھی کو جکڑ لیتی ہے، لیکن میرے خیال سے وہ اب تک پورے طور پر دست بردار نہیں ہوا تھا، فیروزہ کو تنہا بھیجنے اور یہاں اب تک نہ آنے کی وجہ یہی تھی، وہ ڈرتا تھا، یہاں آکر وہ کہیں کھوئی ہوئی محبت پھر نہ پالے، وہ مجھے دیکھتا تھا، اور میں محسوس کرتی تھی، ان آنکھوں میں جو چمک ہے وہ میرے دل میں اترنا چاہتی ہے، لیکن میرے دل پر ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا، اس سے ٹکرا کر لوٹ جاتی تھی یہ چمک میں اب اپنے دل پر پورا قابو حاصل کر چکی تھی۔ وہ جب آیا تو شروع شروع میں میرا دل ذرا ہلا، لیکن پھر قابو میں آگیا، میں ایسا محسوس کرتی تھی، جیسے جمشید مجھے دیکھ کر میرا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے، میرا دل ٹٹولتا ہے، لیکن میرا دل وہ پہلے بھی ٹٹول چکا تھا، اس دل سے پہلے بھی اس نے کچھ نہیں پایا۔ اور اب بھی کچھ نہیں پا سکتا تھا، اتنا قابو پانے کے بعد

کا مزاج پوچھتے، اور اس کی دل دہی بھی کرتے تھے، لیکن اس کی تیمار داری کا سارا بار سیٹھ صاحب نے پروین پر ڈال رکھا تھا، بے چاری کرشنا کماری کا دم خم ختم ہو چکا تھا، اب وہ بے چون وچرا سیٹھ صاحب کے احکام کی تکمیل کرتی تھی، سیٹھ صاحب نے انھیں حکم دیا، اور انھوں نے چپ چاپ پروین کو بختاور کی تیمار داری کے لئے بھیج دیا، دوا پلانا، کھانا کھلانا، اس کے سونے جاگنے کا خیال رکھنا یہ سب باتیں پروین کے فرائض میں داخل کر دی گئی تھیں، جمشید علاج کر رہا تھا، کوئی خاص تشویش کی بات نہیں تھی، امید تھی کہ دو چار روز میں اچھا ہو جائے گا،

رات کا کھانا کھا کے ہم لوگ سینما جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ پروین گھبرائی ہوئی آئی، میں نے کہا "کیا ہے؟"

کہنے لگی،

"مر گئے وہ تو!"

میں نے گھبرا کر پوچھا،

"کون؟ کون مر گیا؟"

"بختاور!"

یہ سن کر ہم سب پر بجلی سی گر پڑی، حواس باختہ ہو گئے، ہر کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا، کہ ایسا کڑیل جوان یوں ذرا کی ذرا میں چٹ پٹ ہو جائے گا، میں اور فیروزہ تو سکتے کے عالم میں کھڑے

غلش ہوتی رہتی تھی، لیکن دامن صبر کو ہم مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے،

جب تک جمشید نہیں آیا تھا، نجتاور ہمارے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح رہتا تھا، فیروزہ کبھی کبھی چڑ بھی جاتی تھی، لیکن میرے ڈر سے کچھ نہیں کہتی تھی، خاموش رہ جاتی تھی، پھر جمشید آگیا، اس کے آتے ہی نجتاور ذرا کھنچ سا گیا، اب وہ ہماری محفلوں میں بہت کم آتا تھا، لیکن جب کبھی آجاتا تھا، تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، جمشید بھی اس سے بڑے تپاک سے ملتا تھا، وہ اور کچھ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، لیکن یہ خوب جانتا تھا کہ سیٹھ صاحب نے اسے غلام سے آقا بنالیا ہے، وہ اس گھر میں نوکر نہیں خاندان کے ایک فرد کی طرح رہتا ہے، سیٹھ صاحب کے بڑے بڑے لکھ پتی اور کروڑ پتی دوست، حکام، اور آفیسران اس سے عزت کا برتاؤ کرتے اور ساتھ بٹھاتے ہیں، سیٹھ صاحب کا اور اس کا دسترخوان ساتھ ساتھ بچھتا ہے، پہلے وہ لقمہ توڑتا ہے۔ تب سیٹھ صاحب روٹی ہاتھ میں لیتے ہیں، پھر بھلا کیسے نہ وہ نجتاور کی عزت کرتا، لیکن بایں ہمہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر کچھ بہت زیادہ خوش نہیں ہوتے تھے، ذرا ڈر کے، کھنچے کھنچے سے رہتے تھے، نہ جانے کیوں؟

ادھر دو تین روز سے نجتاور کو بخار آرہا تھا، باری باری سے میں سیٹھ صاحب، فیروزہ، جمشید، سب ہی اسے دیکھ آتے تھے جاکر اس

"جی ہاں!"

جمشید سیٹھ صاحب کا بڑا ادب کرتا تھا، لیکن اس وقت بڑی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا تھا، معلوم ہوتا تھا، اپنے ہوش میں نہیں ہے میں بھی حیران تھی اور فیروزہ کو بھی حیرت تھی،

سیٹھ صاحب کفن دفن کا انتظام کرنے باہر گئے، پروین بھی کسی کام سے باہر نکل گئی، اب کمرے میں فیروزہ تھی، میں تھی، جمشید تھا، اس نے میری طرف دیکھ کر کہا،

"مجھے شبہ ہے!"

"کاہے کا شبہ؟"

"اسے زہر دیا گیا ہے"

میرا خون خشک ہوگیا، معلوم ہوا پیروں کے نیچے سے زمین نکلی جارہی ہے، میں نے کہا،

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

اس نے کہا

"مجھے شبہ ہی نہیں یقین ہے!"

"ارے یہ کیا کہہ رہے ہو تم!"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے ثابت کرسکتا ہوں!"

میرے دل میں خیال آیا، ہو نہ ہو، یہ سیٹھ صاحب کی حرکت ہے کیونکہ سیٹھ صاحب جلنے لگے تھے اب اس سے، انھیں میرا اور نجتاور کا ملنا جلنا

کے کھڑے رہ گئے، جمشید فوراً اسے دیکھنے کے لئے لپکا، پروین بھی اس کے ساتھ چلی گئی،

کچھ دیر تک میں اور فیروزہ اسی طرح دم بخود کھڑے رہے پھر وہ بولی،

"چلو ذرا دیکھ تو آئیں؟"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا

"چلو"

ہم لوگ بختاور کے کمرے میں پہونچے، ایک چارپائی پر وہ مرا ہوا پڑا تھا، جیسے سو رہا ہو سرہانے سیٹھ صاحب با چشم پُرنم بیٹھے تھے، پائنتی پروین کھڑی تھی، اور نہ جانے کس خیال میں غرق، پٹی کے پاس جمشید بیٹھا تھا، اس کے چہرے کا ایک رنگ آرہا تھا، ایک جارہا تھا، سیٹھ صاحب نے جب اچھی طرح معائنہ کر لیا دریافت کیا،

"ہوگیا انتقال؟"

"جی ہاں!"

"حرکت قلب بند ہوگئی؟"

"جی ہاں!"

"زیادہ تیز بخار میں بھی دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے، اسے بخار بڑا تیز تھا!"

باب ۳۴
اعتراف

فیروزہ جمشید کے ساتھ واپس چلی گئی، اب میں پھر تنہا تھی، وہی خاموش اور افسردہ زندگی پھر میری رفیق تھی، جس سے میں پیچھا چھڑانا چاہتی تھی،

بختاور سے مجھے محبت نہیں تھی، لگاؤ بھی نہیں تھا، میں دل ہی دل میں جلتی بھی تھی اس سے لگاوٹ کی باتیں اس سے کرتی تھی صرف اسے اپنے سے دور اور اپنے قابو میں رکھنے کے لئے، وہ اگر مجھے زیادہ بے بس کر دیتا، تو یہ عین ممکن تھا کہ میں خود کسی روز موقع پاکر اسے زہر دیدیتی، لیکن ان سب کیفیتوں کے باوجود، اس کی جوانی اور بیکسی کی موت پر میرا دل کڑھ رہا تھا، جب خیال آجاتا، پھر دل قابو

ایک آنکھ نہیں جاتا تھا، میں نے فیروزہ کی طرف دیکھا، اس کے چہرے بشرے میں نے اندازہ کیا کہ وہ بھی میری ہم خیال ہے، اس نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"شبہ ہو یا یقین، یہ لفظ زبان سے نہ نکالنا!"

"سیٹھ صاحب سے بھی نہ کہوں!"

"ہرگز نہیں!"

"آخر کیوں؟"

"بات بڑھ جائے گی، معاملہ نازک صورت اختیار کرے گا۔ پولیس عدالت سب ہی بکھیڑے شروع ہو جائیں گے، بدنامی بھی ہوگی، ذلت بھی ہوگی، سیٹھ صاحب کو ان مصیبتوں سے بچانا چاہیئے!"

یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں، لیکن فیروزہ کے کہنے سے وہ خاموش ہو گیا، اس نے میری طرف دیکھا، میرا چہرہ بھی فیروزہ کی تائید کر رہا تھا۔ میں نے کہا

"مرنے والا بے چارہ مر گیا، اب وہ واپس نہیں آسکتا!"

یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں واپس آگئی، اور میرے ساتھ فیروزہ اور جمشید بھی!

نہیں سمجھ سکی تھی، اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے مزاج کا سمجھنا آسان بھی نہیں تھا، یا تو نجتاور سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ وہ ذرا ان کی نگاہ سے اوجھل ہوا اور یہ بیتاب ہوئے، یا وہ مر گیا، لیکن ان کی آنکھ سے دو آنسو بھی نہیں ٹپکے،

میرے لئے سب سے زیادہ تشویش انگیز مسئلہ یہ تھا کہ نجتاور کو زہر کس نے دیا؟ سیٹھ صاحب نے پروین نے؟ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا، کسی بات پر طبیعت نہیں جمتی تھی، ایک کھٹک سی ہونے لگتی تھی دل میں، یہ باتیں جب سوچتی تھی،

ایک روز حسب معمول میں خاموش اور افسردہ بیٹھی ہوئی تھی، کہ سیٹھ صاحب تشریف لائے، کہنے لگے،

"کیا سوچ رہی ہو؟"

میں نے بے دلی کے ساتھ کہا

"کچھ بھی نہیں!"

وہ مسکراتے ہوئے بولے،

"کچھ تو؟"

"فیروزہ کی یاد آرہی تھی!"

"اب تم سیر و تفریح کو بھی کہیں نہیں جاتیں، ایسا بھی کیا سوگ ——!"

میں چونک پڑی، میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا،

میں نہیں آتا تھا، ایک کسک سی ہونے لگتی تھی دل میں، اور خود مجھے سیٹھ صاحب سے نفرت ہونے لگتی تھی، انھیں دیکھکر میرا دل چاہتا تھا ٹیٹوا دبادوں ان کا، ان کی عظمت ومحبت اور اپنی وضعداری ووفاداری کا جو قلعہ میں نے بنایا تھا، وہ اب ٹوٹتا اور گرتا نظر آرہا تھا، میں لاکھ لاکھ اسے سہارا دینے اور روکنے کی کوشش کرتی تھی لیکن اس میں رخنے پڑ رہے تھے، اس کی اونچی اونچی دیواریں ٹیڑھی ہوہو کر گرنے کے قریب ہو رہی تھیں،

اب سیر و تفریح سے میں یک قلم کنارہ کش ہو چکی تھی، جی ہی نہیں لگتا تھا کسی کام میں، ہر وقت بختاور اور سیٹھ صاحب کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی تھی۔ کتابوں سے مجھے بڑا شوق تھا لیکن اب کتابیں بھی مجھے کاٹنے کو دوڑتی تھیں، چپ چاپ لیٹی ہوئی ہوں اور کچھ سوچ رہی ہوں، باہر آنا جانا بھی میں نے بڑی حد تک ترک کر دیا تھا، تربیت گاہ میں نے کس شوق سے قائم کی تھی لیکن اب کئی کئی دن گذر جاتے تھے، اور میں وہاں کا رُخ بھی نہیں کرتی تھی، خود کرشنا کماری کبھی کبھار میرے پاس آگئیں، تو آگئیں گھڑی دو گھڑی باتیں ہوگئیں، اور پھر وہی خاموشی، پھر وہی سناٹا، بے چاری زبان سے کچھ نہ کہتیں، اور اوبھ کر چلی جاتیں ——— !

سیٹھ صاحب کے مزاج کو اتنا ساتھ رہنے کے باوجود میں ابتک

مزے مزے لیکر اس کی جان کنی اور مرنے کا ذکر کیا کرتی ہے"

مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی، میں نے کہا،

"واقعی ؟"

"واقعی نہیں تو کیا غیر واقعی ؟ آتی ہی ہوگی، ابھی پوچھ لینا خود اس سے !"

"اس وقت اس کا کام کیا ؟ وہ تو اب سونے کے لئے لیٹ بھی رہی ہوگی !"

"یہ اچھی کہی، وہ تو میری اسسٹنٹ بنادی گئی ہے، ۱۰ بجے رات کو روز آکر مجھے رپورٹ دیتی ہے، تب کہیں جاکر سوتی ہے !"

"مجھے بالکل خبر نہیں ——— پھر تو تنخواہ بھی مقرر کر دی ہوگی اس کی سیٹھ صاحب نے !"

"ہاں ہاں وہی تنخواہ اس کی ہے، جو میری ہے !"

میں نے حیرت سے پوچھا،

"سچ"

وہ ابھی کوئی جواب بھی نہیں دینے پائی تھیں، کہ پروین آگئی، اس نے کرشنا سے کہا،

ماہرو کو ۱۰۳ ڈگری کا بخار ہے، دوا میں دے آئی ہوں، لیکن رات بھر اس کی تیمار داری کی ضرورت ہے، میں نے دو دو گھنٹہ ڈیوٹیاں طالبات کی مقرر کر دی ہیں، اب ۱۰ بجے ہیں بارہ بجے تک آپ

"سوگ ؟ کیسا سوگ ؟ کس کا سوگ ؟"

وہ پھر مسکرائے۔

کہنے لگے "اچھا جانے دو ان باتوں کو، ہاں یہ بتاؤ، کہیں سیر کرنے چلو گی ؟ میں جا رہا ہوں !"

میں نے کہا،

"آپ ہو آئیے میں نہیں جاؤں گی، میرے سر میں درد بھی ہو رہا ہے ——— !"

"سیر کر آؤ گی تو جاتا رہے گا !"

"اور بڑھ جائے گا، میں جانتی ہوں اپنی طبیعت کو !"

"اچھا بھئی تم جانو، ہم تو جاتے ہیں !"

یہ کہہ کر سیٹھ صاحب چلے گئے سیر کرنے، میں پھر سوچنے لگی، کیا چیز ہیں ہمارے سیٹھ صاحب بھی، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، لیکن اتنے مطمئن کہ جیسے کبھی مرنا ہی نہیں، مجھے اب کامل یقین ہو گیا تھا بختاور کی موت کے ذمہ دار یہی ہیں، اور اس یقین کے ساتھ ہی میرے دل میں نفرت حقارت اور انتقام کا طوفان لہریں لینے لگا تھا،

رات کو کوئی ۹ بجے ہوں گے، میں کرشنا کماری کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی، اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ پردیں کا ذکر چھڑ گیا کہنے لگی،

"وہ تو اتنی خوش ہے بختاور کے مرنے سے جیسے عید ہو گئی ہو،

وہ مسکرا کر لکھنؤ کے پُر تکلف لہجہ میں بولی

"جی نہیں، مجھ سے زیادہ آپ کو !"

میں نے کہا

"آخر کوئی وجہ ؟"

"یہ تو کسی کا چہیتا مر جائے اور اسے غم نہ ہو !"

یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی، میرا غصہ کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا لیکن میں ضبط کر گئی، میں نے کہا

"اگر وہ چہیتا تھا تو تمہارا، میرا کیوں ہونے لگا ؟"

"جی نہیں پہلے وہ میرا تھا، پھر آپ کا ہو گیا تھا، اور جب سے آپ کا ہوا تھا، میں اس سے نفرت کرنے لگی تھی !"

"تم اس سے نفرت کرنے لگی تھیں، سچ کہہ رہی ہو !"

"ہاں ہاں بالکل سچ !"

"پھر تم نے اس کی تیمارداری کیوں کی ؟"

"اگر میں تیمارداری نہ کرتی، تو وہ اِتنی جلدی مرتا کیسے !"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم نے اِسے زہر دے کر مارا ہے !"

"یہی سمجھ لیجئے !"

"اور اگر یہ بات پولیس تک پہنچی تو !"

"یہ شوق بھی پورا کر لیجئے، دیکھوں گی میرا کیا بگاڑ لیتی ہیں آپ ؟"

"تم پولیس سے بھی نہیں ڈرتیں !"

"بیٹھ آئیے، پھر باری باری سے طالبات جائیں گی"

بیچاری نے "اچھا" کہا، اور میرا منہ دیکھتی ہوئی چلی گئیں گویا کہہ رہی تھیں دیکھ لو یہ میری اسسٹنٹ ہے، لیکن مجھے اپنا اسسٹنٹ سمجھتی ہے، اور میرے اوپر اپنا حکم چلاتی ہے۔

پروین جب جانے لگی، میں نے اس سے کہا،

"ذرا بیٹھو باتیں کریں گے!"

وہ بیٹھ گئی، میں نے کہا

"کہو تربیت گاہ کا کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے ——— (مسکرا کر) کہئے آپ کا کیا حال ہے؟"

"اچھی ہوں ——— لیکن یہ کس کی باتیں کر رہی ہو تم!"

"کیوں کیا ہوا؟"

"تم مجھ سے اتنی شوخ تو کبھی نہ تھیں!"

"میں نے تو ایک سیدھی سی بات پوچھی تھی، آپ اس کا جو چاہیں مطلب لیں، آپ کی زبان کون پکڑ سکتا ہے!"

میں خاموش ہو گئی، میں نے سوچا اس سے باتیں کرنا اور الجھانا بیکار ہے، وہ بھی تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر گویا ہوئی،

"مختاور کی موت کا بڑا غم ہوا ہوگا آپ کو!"

جیسے میرے کسی نے تیر مار دیا ہو، میں پہلو بدل کر بولی

"مجھ سے زیادہ تو نہیں ہوا ہوگا!"

"مجھے کیا نہیں معلوم؟ سب جانتی ہوں میں ایک ایک بات!"

خاموش ہو گئی، وہ بھی چپ چاپ بیٹھی رہی، پھر میں نے اس سے پوچھا،

"مختاور کو مارنے سے تمہیں کیا ملا؟"

"میرا دل ٹھنڈا ہو گیا، میں کیوں اس پر رحم کرتی، جس نے اپنے آقا سے بے وفائی کی، وہ کیوں زندہ رہنے دیا جاتا!"

"تمہاری باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ سیٹھ صاحب بھی شریک جرم ہیں ——!"

"ہاں ہیں تو، جائیے ان کی بھی رپورٹ کیجئے پولیس میں، ایک وفادار بیوی سے اور توقع ہی کیا ہو سکتی ہے؟"

"تم نے اور سیٹھ صاحب نے اگر مارا ہے اسے، تو اس کا ذکر کیوں کرتی رہتی ہو، اگر کسی نے سن لیا تو؟"

"میں نے تو آپ سے کہا ہے، کسی اور سے کیوں کہوں گی؟ اور یہ جانتی ہوں کہ آپ میں یہ ہمت نہیں کہ کسی سے چوں بھی کر سکیں، اور اگر آپ نے ایسا کیا بھی، تو سیٹھ صاحب، سیٹھ صاحب ہیں، ان پر ہاتھ کون ڈال سکتا ہے!"

"مجھے کہنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟"

"پھر میرا دل کیسے ٹھنڈا ہوتا؟"

"اب ٹھنڈا ہو گیا!"

"بالکل نہیں؟ کیوں ڈروں؟ ثبوت کیا ہے آپ کے پاس یا آپ کی پولیس کے پاس!"

"پولیس گئی چولھے میں، ابھی جاکر سیٹھ صاحب سے کہتی ہوں!"

وہ پھر زور سے ہنسی، اس نے کہا،

"ضرور جائیے سیٹھ صاحب کے پاس ذرا دیکھوں تو آپ کیا کہتی ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں!"

پروین کی یہ بے باک سُن کر میرا غصہ جاتا رہا، اور ایک دہشت کی حیرت کی، کیفیت میرے اوپر طاری ہوگئی، میں نے کہا،

"عجیب عورت ہو تم!"

وہ تنک کر بولی،

"عجیب میں ہوں یا آپ؟ بڑی دیوی بنتی تھیں، پھانس لیا نجتاور کو، یہ بھی نہ سوچا بوڑھے شوہر کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ ہم بھی پارسائی کا دعویٰ نہیں کرتے، ہم تو بُرے ہیں، اور ڈنکے کی چوٹ بُرے ہیں، لیکن جب تک وہ زندہ رہے، ہم نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا!"

"کیا بک رہی ہو تم، تم سمجھتی ہو میں آوارہ ہوں تمہاری طرح سے!"

"کچھ میں اکیلی سمجھتی ہوں! دنیا سمجھتی ہے، سیٹھ صاحب بھی سمجھتے ہیں!"

"تمہیں کیسے معلوم سیٹھ صاحب مجھے آوارہ سمجھتے ہیں!"

"ارے آپ رونے لگیں؟ اچھا آنسو پونچھ ڈالئے، میں بتائے دیتی ہوں اس کا نام!"

میں نے روتے روتے اس کی طرف دیکھا اور آنکھ جھکالی، اس نے ایک تبسم کے ساتھ کہا،

"لیکن بہت معمولی آدمی ہے، نجتاور سے بھی زیادہ معمولی!"

میں کچھ نہیں بولی گردن جھکائے روتی رہی، اس نے کہا،

"کہہ تو رہی ہوں اب نہ روئیے، میں اس کا نام بتائے دیتی ہوں ——— دربان ہے وہ!"

اب تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، میں نے کہا،

"کیا کہا؟"

بڑے اطمینان سے بولی۔

"دربان اور کون؟"

میں نے کہا۔

"تم بڑی بے شرم ہو کہ مجھ سے اس طرح کی باتیں کر رہی ہو!"

"اے ہے بڑی آئیں شرم والی، یہ باتیں اس سے کیجئے گا، جو جانتا نہ ہو آپ کو، اور آپ کی شرم کو یہاں ہر ہر بات معلوم ہے سب کی ———!"

"تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم ہے، تم جھوٹی ہو!"

وہ ہنسی، اس نے کہا،

"ہوگیا ——— آپ کا یہ اترا ہوا چہرہ، یہ رونی صورت، یہ پرنم آنکھیں، دیکھ کر میں اتنی خوش ہو رہی ہوں، جتنی آپ بختاور کو مجھ سے چھین لینے پر بھی خوش نہیں ہوئی ہوں گی!"

"مجھے تو اس کے مرنے کا بالکل غم نہیں ہے!"

"ہاں آپ کو کیوں ہوگا اس کا غم ؎

وہ نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

میں حیران و ششدر اس کی باتیں سن رہی تھی، اس نے کہا

"آیئے ایک سمجھوتہ کرلیں!"

"کیا؟"

"میں جس آدمی کو اپناؤں، آپ اسے مجھ سے چھین لیجئے!"

"مجھے کیا ضرورت ہے چھین لینے کی، پھر تاک لیا ہوگا کسی کو!"

"اور نہیں تو کیا خالی بیٹھے ہیں کوئی!"

"کون ہے وہ؟"

"کیوں بتائیں ——— بھئی اب ڈر لگتا ہے آپ سے میں پھر منہ دیکھتی رہ جاؤں گی، اور آپ اسے لے کر چمپت ہو جائیں گی!"

یہ باتیں میرے لئے تیر و نشتر سے کم نہیں تھیں، میں سمجھ رہی تھی، یہ پروین نہیں بول رہی ہے، سیٹھ صاحب بول رہے ہیں، مجھے رونا آگیا، میں رونے لگی،

اس نے مجھے روتے دیکھ کر کہا،

"کچھ بھی تو نہیں ——— اچھا بڑی رات آگئی ہے، اب جاتی ہوں ———!"

وہ بولیں۔

"چلی جانا، ذرا دیر تو اور بیٹھو، تم سے تو کچھ باتیں ہی نہیں ہوئیں ابھی تک!"

میں نے اُٹھتے اُٹھتے کہا

"نہیں بھئی اب سوئیں گے، نیند آرہی ہے، تم بھی سو جاؤ کب تک جاگو گی!"

"آئی نگوڑی نیند، جانے کیا ہوگیا ہے، رات رات بھر نیند نہیں آتی، پروین کے تماشے دیکھا کرتی ہوں ساری رات!"

"کیسے تماشے ———؟"

"اب وہ دربان کے پیچھے پڑی ہیں، نئی نئی اسسٹنٹ کیا ہوئی ہیں، نگرانی کے شوق میں نیند ہی نہیں آتی، رات بھر جا جا کر اس سے چھیڑیں کرتی ہیں، کہ جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے، جب دیکھو جب اسی کی شکایت، رات بھر خراٹے لے لے کر سویا کرتا ہے، پہرہ دیتا ہی نہیں موا۔ کام چور نمک حرام!" اور وہ بھی ایسا ڈھیٹ ہے، جب یہ جائیں گی سوتا ہی ملے گا!"

میں نے کہا،

"ہوگا ———!"

"مجھے تو اب بے چارے دربان کی خیر نہیں نظر آتی، ترس آرہا ہے، مجھے اس کی جوانی پر ——— !"

یہ طنز کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھ گیا، لیکن میں بے بس تھی، کیا کرسکتی تھی اس عورت کا؟ پھر میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے لیکن میں نے انھیں روکا، میں نے کہا

"پروین تم چلی جاؤ یہاں سے!"

"اور اگر میں نہ جاؤں!"

"تو بھی تمہارا کچھ نہیں کرسکتی، تم سے درخواست کرتی ہوں، کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ——— !"

"میرا تو ابھی جی نہیں چاہ رہا ہے جانے کا!"

"تو اپنے دربان کے پاس جاؤ وہیں بیٹھو!"

"کھٹکنے لگا وہ آپ کو؟ اب کاہے کو بچے گا بے چارا!"

یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسی، اتنے میں کرشنا کماری آگئیں، انھوں نے آتے ہی کہا،

"بارہ بج گئے، اب جاؤ کسی اور کو بھیجو، ماہرو کے پاس، اس وقت تو اس کی آنکھ لگ گئی ہے!"

پروین چلی گئی، کرشنا نے جو مجھے گم سم دیکھا تو کہا،

"کیا بات ہوئی چپ چپ کیوں ہو!"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا،

باب ۳۵
فیصلہ

بختاور کی جگہ زیادہ عرصہ تک خالی نہیں رہی، سیٹھ صاحب نے ایک نیا اسلامی ڈھونڈ لیا، "موہن" ——— اس کی بھی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی، اس پر سیٹھ صاحب پروانہ وار قربان ہوتے تھے، اس میں اور بختاور میں فرق یہ تھا کہ وہ منچلا تھا، اپنی قدر و قیمت پہچانتا تھا۔ لہٰذا سیٹھ صاحب پر چھا گیا، وہ ان کی آنکھوں کے سامنے جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ ایک بے بس معمول کی طرح وہ سب کچھ دیکھتے تھے، یہی نہیں اس کی مدد تک کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے،

اس کے برعکس موہن بندۂ بے دام تھا، دیدہ زیب بختاور سے کم نہیں تھا، لیکن وہ رکھ رکھاؤ اور آن نہیں تھی اس میں یہی وجہ تھی کہ خود سیٹھ صاحب اس پر چھا گئے تھے، سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا،

کہنے لگیں،

"ہوگا کیا؟ وہ بھی بڑا نکما ہے!"

"تو پروین بہت جی لگا کر کام کر رہی ہے!"

"ہاں بس یہی کام رہ گیا ہے، رات بھر کھٹ کھٹا کھٹ کرکے میرے سر پرے گزرنا اور موئے دربان کو سوتے سے جگانا، اسی لئے تو میری نیند اُڑ گئی ہے، پلک جھپکی، اور ان کی کھٹ کھٹا کھٹ شروع ہوئی، میں تو عاجز آگئی، ہاں بھئی!"

وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں، میں چلی آئی!

سادگی اور شرافت کی آڑ لے کر اسے بھی اپنا آلۂ کار بنا سکتا تھا، یہ اگر بوڑھا ہوتا، تو میرے لئے اس کے نام پر زندگی تیر کر دینا کیا مشکل تھا؟ میں تو اپنے گھر سے جب چلی تھی، اپنے جذبات وہیں دفن کر آئی تھی؟ میں نے تو یہ سوچ کر اس سے شادی کی تھی کہ ساری زندگی خدمت میں ——— بوڑھے شوہر اور مظلوم عورتوں کی خدمت میں گزار دوں گی، لیکن یہ میرے سامنے ہوس کے کھیل کھیلتا رہا، میرے سامنے جذبات کے دھارے میں بہتا رہا، میرے سامنے نوجوان مرد اور نوجوان عورتوں کی زندگی تباہ کرتا رہا، میرے سامنے بدی آوارگی اور بدمعاشی کے کارناموں کا مظاہرہ کرتا رہا، یہ اپنے دل پر، اپنی ہوس رانی پر، اپنی بے راہ روی پر بڑھاپے کے باوجود ذرا بھی قابو نہ رکھ سکا ———

پھر میں کیوں اس کے نام کا وظیفہ پڑھتی رہوں؟ میں کیوں اس کی پابند رہوں؟ میں کیوں اپنے جذبات کو کچلتی رہوں؟ میں کیوں پاک دامنی کی دیوی بنی رہوں؟ میں کیوں عفت و عصمت کے خیالی دیوتا کی پوجا کرتی رہوں؟ کیوں نہ میں بھی کھل کھیلوں؟ کیوں نہ میں بھی اپنے جذبات کا بند توڑ دوں، کیوں نہ میں بھی اپنی حسرتیں پوری کروں، کیوں نہ جوانی کی لذت میں بھی حاصل کروں؟ یہ بوڑھا ہے، اور جوانوں سے زیادہ بے قابو ہے، میں تو ابھی نوجوان ہوں، اس کے جذبات مصنوعی ہیں، اور میرے جذبات حقیقی، میں نے چاہا تھا کہ اپنی زندگی اس طرح

اور ان کے اشارۂ چشم پر رقص کیا کرتا تھا

اب میرے سینے کے اندر آتش فشاں پہاڑ لاوا اگل رہا تھا جو ننگ و ناموس، عزت و آبرو، پاس وفا اور وضعداری کے خیال کو ہری بھری کھیتیوں کی طرح جلائے دے رہا تھا، اب میرے دل میں جذبات کا طوفان لہریں لے رہا تھا، وہ طوفان جس کا جوش بڑھتا چلا جا رہا تھا جو کسی کے روکے نہیں رک سکتا، جو بڑے سے بڑے بند کو توڑتا ہوا مضبوط سے مضبوط پل کو ڈھاتا ہوا بڑی بڑی عمارتوں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا ہے جسے کوئی نہیں روک پاتا۔ جس کا مقابلہ کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوتی،

میں سوچ رہی تھی کہ میں نے سیٹھ صاحب کو اپنا رفیق زندگی اس لئے بنایا تھا، انھیں میری ضرورت تھی، میں نے ان پر اس لئے رحم کھایا تھا کہ وہ بوڑھے تھے، انھیں ایک سہارے کی ضرورت تھی، میں اپنے محسن کو یہ سہارا کیوں نہ دیتی؟ لیکن اب حالات بدل چکے تھے پردے اٹھ چکے تھے، حقیقت سامنے آچکی تھی، یہ بوڑھا دل ہوس رانیوں کا مرکز تھا، اس کمزور سینہ میں جنسی آوارگی اور بے راہ روی کا سمندر لہریں مار رہا تھا، یہ وہ شخص تھا۔ جو اپنے بوڑھے دل کی تسکین اور اپنے بوڑھے جذبات کی آسودگی کے لئے، بھولے بھالے، کم مایہ اور بے روزگار نوجوانوں کی زندگی تباہ کر سکتا تھا۔ مجبور اور ستم زدہ عورتوں کی آبرو لٹوا سکتا تھا، اپنی زندگی کو بے یار و مددگار چھوڑ سکتا تھا اور اسکی

اپنا بختاور یا موہن بنالوں؟ میں سینما جاتی تھی، موٹر پر سیر و تفریح کو نکلتی تھی، جلسوں اور تقریبوں میں شرکت کرتی تھی، اور جس نوجوان کو دیکھ لیتی تھی، دل ہی دل میں لٹو ہو جاتی تھی، سوچنے لگتی تھی کس طرح موقع ملے اور میں اسے لے کر کہیں بھاگ جاؤں، بعض نوجوانوں پر تو میں نے لگاوٹ کی نگاہ بھی ڈالی، اور انھوں نے میری یہ دعوت آنکھوں آنکھوں میں قبول بھی کر لی، مگر ابھی ناتجربہ کار تھی، نوآموز تھی۔ ان نگاہوں کی تاب نہیں لاسکی، اپنی آنکھیں جھکا لیں، اپنے دل سے ان کا خیال نکال دیا، لیکن طبیعت تھی کہ مچل رہی تھی، دل بے قابو ہوا جا رہا تھا، نہ دن کو چین نہ رات کو آرام، ہر وقت ایک خلش، ہر وقت ایک اضطراب، ہر وقت ایک ہیجان،

میں نے سوچا یہ نظر بازی ٹھیک نہیں ہے، اس طرح میں اپنی ناتجربہ کاری کے سبب کر کچھ نہیں پاؤں گی، بدنام ضرورت سے زیادہ ہو جاؤں گی، بہتر یہ ہے کہ پہلے ہیاؤ حاصل کر کے، محبت پیدا کر کے اس فن کی ٹریننگ حاصل کروں، کہیں الگ چپکے چپکے، پھر جس کلب جس محفل، جس جگہ سے چاہوں گی، آنکھ کے اشارے، میں جسے چاہونگی اپنا اسیر کر لوں گی، مجھے اپنے حسن و خوبروئی پر اعتماد تھا۔ آئینہ روز میرے اس حسن ظن کو مستحکم کیا کرتا تھا،

پھر ایسا ہوا کہ سیٹھ صاحب اپنے موہن کو لے کر کشمیر چلے گئے، ہنی مون منانے ——— ارے آپ پھر ہنس رہے ہیں؟ سچ تو

گزار دوں کہ دنیا میں رہوں اور دنیا سے تعلق نہ رکھوں، لیکن جب یہ نہیں ہو سکا، تو دنیا میں رہ کر دنیا کے مزے میں کیوں نہ اڑاؤں، میں کیوں نہ وہ پھل چکھوں، جسے یہ بڑھاپے کے باوجود کھائے جا رہا ہے اسے ہیضہ ہو سکتا ہے، اور میں اسے ہضم کر سکتی ہوں،

کئی روز تک میں اسی شش و پنج میں گرفتار رہی ایک رات کو یہ فیصلہ کرتی تھی کہ چھوڑ دوں ننگ و ناموس کا خیال، اور جوانی کی بہار جتنی لوٹ سکتی ہوں، لوٹ لوں، دوسری رات کو یہ فیصلہ بدل جاتا تھا اور میں پھر اسی خیال پر آجاتی تھی۔ کہ سیٹھ صاحب کا جو جی چاہے کریں میں کیوں اپنی راہ چھوڑوں؟

نجتاور کو ہلاک کرنے کے بعد بھی اگر سیٹھ صاحب راہ راست پر آجاتے یا کم از کم اس کے قائمقام اور جانشین کو نہ تلاش کر لیتے تو میں اپنی وضع پر قائم رہتی اور عفت و عصمت کی دیوی بنی رہتی لیکن جب انھوں نے موہن کو رکھ لیا۔ اور پھر رنگ گئے اپنے رنگ میں تو ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، میں نے فیصلہ کر لیا، یہ شخص اسی کا مستحق ہے کہ اس کے سینے پر کودوں دلی جائے، اور اگر اس کے منہ پر کالک لگائی جا سکتی ہے، تو ضرور لگا دی جائے،

میں وہی تھی جو جنس مقابل کا خیال تک دل میں نہیں لاتی تھی اور اب وہی میں تھی جو ہر نوجوان پر للچائی ہوئی نظر ڈالتی تھی، کہ کسی طرح اسے اپنے دل میں رکھ لوں؟ کس طرح اسکی ہو رہوں؟ کسطرح اسے

آپ کی ہو رہی، اب یہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ میرا مستقبل کیا ہو؟ ——— بتائیے آپ مجھے دھوکا تو نہیں دیں گے؟ آپ تو میرا دل نہیں توڑیں گے؟ ——— بتائیے نا!

میں نے دیکھا، اس کی آنکھیں پرنم تھیں، بڑے پیار سے میں نے کہا۔ "تم تو خود ہی کہہ چکی ہو۔ ہر مرد سیٹھ صاحب نہیں ہو سکتا میں ہرگز تمہیں دھوکا نہیں دوں گا، زندگی کے آخری سانس تک تمہارا کلمہ پڑھتا رہوں گا، تم میرے دل کی رانی ہو، میں تمہیں پوجتا ہوں،

اس کے چہرے پر رونق آگئی، وہ مسکرائی۔ اس نے اپنی گردن میرے بازو پر ڈال دی، کہنے لگی،

"مجھے یہی اُمید تھی، میرا دل کہہ رہا تھا، آپ یہی جواب دیں گے کتنے اچھے ہیں آپ!"

میں نے کہا، "لیکن یہ تو بتاؤ!"

"پوچھئے!"

"سیٹھ صاحب کشمیر ہی میں تو نہیں رہ جائیں گے، بہرحال پھر آئیں گے۔ پھر کیا ہو گا ———؟"

"اس کی پرواہ آپ کیوں کرتے ہیں؟ یہ وہی ماہرو والا خاص باغ ہے جس طرح اب میں یہاں تبادلہ آب و ہوا کے بہانے سے ایک مہینہ ہوا کھا رہی ہوں آئندہ بھی مہینہ میں چار چھ روز یہاں اسی طرح گزار جایا کروں گی، یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ بڑی محفوظ جگہ ہے سیٹھ

کہہ رہی ہوں، ہنی مون ہی منانے گئے ہیں، وہ وہاں ——— توبہ اچھا ہنس لیجئے جی بھر کے، جلیئے ہم نہیں کہتے

اور مجھے موقع مل گیا، یہ بوڑھا جس کے ذریعے سے آپ یہاں آئے، پہلے رنڈیوں کا دلال تھا، میں نے اسے اپنا دلال بنا لیا، اس کی جیب میں نے روپیہ سے بھر دی، اور تاکید کر دی، کوئی ایسا پٹھا تلاش کر کے لائے، جو میری طرح نوآموز ہو، وہ مجھے ٹریننگ دے اور میں اسے ٹریننگ دوں، پھر جب میں چوکس ہو جاؤں گی، اسے نکال پھینکوں گی، اور خود تیتر ہی کی طرح کبھی اس پھول پر، کبھی اس پھول پر ———!

وہ گیا، اور آپ کو لے آیا، نہ جانے کیا کشش تھی آپ میں کہ پہلی ہی نظر میں آپ نے مجھے اپنا بنا لیا، اور میں بے بس ہو گئی، نکلی تھی اس لئے کہ ہرجائی بن جاؤں گی، لیکن میں ایک ہی کی ہو رہی، آپ کا دامن پکڑا، اور اب اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، چاہتی ہوں کہ ساری زندگی آپ ہی کے رحم و کرم پر گزار دوں، دل دھڑکتا ہے، بھڑکاتا ہے، کہتا ہے یہ حضرت بھی کہیں رنگے سیار نہ ہوں، سیٹھ صاحب کی طرح دھوکا دیں، اپنی حسرت پوری کر کے تجھے ٹھوکر نہ لگائیں، لیکن میں دل کو سمجھاتی ہوں، پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ہر مرد سیٹھ صاحب نہیں ہو سکتا، ہر عورت پروین نہیں ہو سکتی، یہ امید ہے جس نے مجھے ہرجائی بننے سے روک لیا، اور میں دل و جان سے

باب ۳۶
انجام

میرے اور شیریں کے تعلقات جسم و جان کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، وہ محبت کی بھوکی تھی، اور میں جوانی کا بھوکا تھا، وہ مجھ سے محبت لے رہی تھی، اور میں اس سے جوانی لے رہا تھا، دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے، دونوں کی ضرورتیں ایک دوسرے سے پوری ہو رہی تھیں، اسی طرح کئی ہفتے اور گذر گئے،

دفعتاً لکھنؤ سے میرے بڑے بھائی آئے، انھیں سن گن مل چکی تھی کہ میں "آوارہ" ہوا جا رہا ہوں۔ رات رات بھر گھر سے غائب رہتا ہوں اگر یہی لچھن رہے، تو ہاتھ سے نکل جاؤں گا، وہ سایہ کی طرح میرے ساتھ رہے، ان کی موجودگی میں شیریں کے ہاں میں نہ جا سکا، ایک دن بڑے میاں آئے، انھیں میں نے سارا ماجرا بتا دیا، یہ بھی کہہ دیا یہ مجھے لینے آئے ہیں، ان کے ساتھ میں لکھنؤ جا رہا ہوں، ہفتہ

صاحب تو بھول کے بھی نہیں آتے یہاں!"

"لیکن اگر سیٹھ صاحب کو کچھ شک ہوا، یا پتہ چل گیا تو؟"

وہ عزم و استقامت کی تصویر بن کر بولی،

"تو کیا؟ وہ کس منہ سے اب مجھ پر اعتراض کریں گے۔ ان کی زندگی کا سارا دفتر کھول کر رکھ دوں گی ان کے سامنے پھر ان کی ہمت ہوگی کہ مجھے ٹوکیں؟"

"کیا کرلیں گے میرا؟ انھیں اپنی ناک اور عزت کا بڑا خیال ہے وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔ بے تعلق ہو سکتے ہیں۔ سو وہ اب بھی بے تعلق ہیں۔ اور اگر انھوں نے مجھے چھوڑ دیا بھی، تو کیا آپ مجھے سہارا نہ دیں گے ——!"

"کیوں نہیں دوں گا؟ سر آنکھوں پر رکھوں گا تمھیں!"

وہ مسکرائی، اور اس کے موتی کے سے دانت اس طرح چمکنے لگے، جیسے اندھیرے میں بجلی چمکتی ہے

اب تارے جھلملانے لگے تھے، صبح نمودار ہو رہی تھی، بڑے میاں دروازہ کھٹکھٹا کر ناخواندہ مہمان کی طرح وارد ہوئے اور آتے ہی انھوں نے فرمایا چلیے۔

میں نے بڑی بے تکلفی سے کہا "چلیے!"

شیریں کی یاد آئی، پھر رات کی وہ محفلیں اور شیوا طرازیاں یاد آئیں، جن سے ایک عرصہ دراز تک میں لطف اور لذت حاصل کرتا رہا تھا،

لیکن مشکل یہ تھی کہ بڑے میاں لاپتہ تھے، اور بغیر ان کے قصر شیریں میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا، اگر ایسی ہمت کرتا بھی تو سر کا ایک بال بھی سلامت نہ رہتا، کئی بار میں نے باغ کا چکر رات کے وقت لگایا، لیکن نہ وہاں روشنی تھی، نہ زندگی کی کوئی علامت معلوم ہوتا تھا، یہ نشیمن اجڑ چکا ہے، ایک عجیب سناٹا سا چھایا ہوا تھا، میں بار بار اس کی کوشش کرتا تھا، کہ کسی طرح بڑے میاں سے ملاقات ہو جائے، حالات معلوم ہوں، اور وہ سلسلہ پھر شروع ہو جائے، جو میری غیر حاضری میں ٹوٹ چکا تھا، لیکن بڑے میاں عنقا کا حکم رکھتے تھے، کیا مجال جو کہیں راستہ گلی میں بھی ان سے مڈبھیڑ ہو جائے،

اسی تلاش و جستجو اور تگ و دو میں ایک مہینہ اور گزر گیا، ایک روز اتفاقاً راستہ چلتے وہ مجھے مل ہی گئے، میں نے لپک کر ان کا دامن جا پکڑا،

"اجی حضرت کچھ ہماری بھی تو سنیے، آپ ابتک تھے کہاں؟"

"یہیں تھا اور کہاں تھا"

"پھر ملے کیوں نہیں؟"

عشرہ میں واپسی ہوگی، واپس آؤں، پھر مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہوگی میں ہوں گا، شیریں ہوگی، بڑے میاں شیریں کی بے تابی کی تصویر میرے سامنے کھینچتے تھے، اس کے اشتیاق کا اظہار کرتے تھے، اس کی بے چینی کی کہانی بیان کرتے تھے، اس کی طرف سے پیام دعوت لے لے کر آتے تھے، لیکن میں بے بس تھا، بھائی صاحب جہاں بھی میں جاؤں میرے ساتھ ساتھ جاتے تھے۔

چند روز بعد میں لکھنؤ چلا گیا، وہاں پہونچتے ہی تسنیم کا عشق پھر تازہ ہوگیا، آخر وہ دن بھی آگیا۔

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے

میری شادی ہوگئی، تسنیم میری ہوگئی، میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا، اب نہ مجھے شیریں یاد تھی، نہ وہ رنگ رلیاں، تسنیم تھی، اور میں تھا، وہ چاندنی میں چکور، ایک بے خودی کا نشہ سا چھایا ہوا تھا،

مہینہ بھر کے بعد میں پھر اپنے مستقر پر واپس چلا، تسنیم کے بغیر اب میری زندگی نہیں گزر سکتی تھی اسے اپنے ساتھ لے آیا یہاں آکر بھی میں تسنیم میں ایسا محو رہا، کہ مجھے شیریں کا خیال تک نہیں آیا،

شیر جب شکم سیر ہوکر کھانا کھا چکتا ہے، تو زبان سے اپنی مونچھیں چاٹتا ہوا خراماں خراماں دریا کی طرف پانی پینے جاتا ہے، میں پیٹ بھر کے کھانا کھا چکا تھا، اب دریا کی طرف پانی پینے جا رہا تھا، اب پھر مجھے

"کیا بیمار تھی وہ؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"تو خود بخود مرگئی!"

"رات کو اچھی بھلی سوئی صبح کو مری ہوئی اٹھی!"

"ڈاکٹروں نے تو دیکھا ہوگا، کیا تشخیص کی انھوں نے!"

"سانپ نے ڈس لیا تھا اسے!"

"سیٹھ صاحب کا کیا حال ہے؟"

"مگن ہیں"

بڑے میاں نے اپنی راہ لی اور میں اپنے گھر واپس آیا، سوچ رہا تھا، کس قدر جلد شیریں اس دنیا سے کوچ کرگئی؟ اس نے شعلہ کی طرح اپنی جھلک دکھائی، اور بجھ گئی، وہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکی، اور فوراً ہی موت کے بادل میں منہ چھپا لیا اس نے، وہ تارے کی طرح جھلملائی، اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی، ہائے کیا تھا، اور کیا ہوگیا اس خبر نے میرے ہوش و حواس غائب کر دیئے، میں پاؤں رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا، گرتا پڑتا گھر پہنچا، معلوم ہو رہا تھا، کئی دن کا بیمار ہوں، تسنیم مجھے اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئی، اس نے کہا،

"یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟"

میں نے بے رخی سے جواب دیا، کچھ نہیں طبیعت خراب ہے

تم گھبراؤ مت صبح تک اچھا ہو جاؤں گا؟"

"کیا کرتا ہل کر؟"

"کیوں؟"

"وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا!"

"یعنی!"

"شیریں اب اس دنیا میں کہاں؟"

میں سُن سے ہوگیا، میری آنکھوں کے پیچھے اندھیرا آگیا، قریب تھا کہ میں لڑکھڑا کر گروں، اور بے ہوش ہوجاؤں، لیکن میں نے اپنے تئیں سنبھالا، اور بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پاکر بولا،

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"وہ مرگئی!"

"اس قدر جلد؟ کیسے؟"

وہ ہنسے انھوں نے کہا، اس قدر جلد کے کیا معنے؟ موت اس سوال پر غور نہیں کرتی؟ وہ جب آتی ہے۔ تو جو اس کے سامنے آجاتا ہے، اسے لے مرتی ہے!"

"لیکن وہ اس کے سامنے گئی کیوں؟"

"کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں آپ؟ موت کے سامنے کوئی جاتا ہے موت خود ہی جس کے سامنے چاہتی ہے، آجاتی ہے!"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"تم بھی مرجاؤ" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے، میں نے پھر ان کا دامن پکڑا

نفیس ترین لٹریچر

ناول

نام کتاب	مصنف	آنے روپے
غازی صلاح الدین	رئیس احمد جعفری	۰ — ۶
فاتحِ خیبر	رئیس احمد جعفری	۸ — ۵
حجاج بن یوسف	رئیس احمد جعفری	۴ — ۵
طارق	رئیس احمد جعفری	۰ — ۶
دامِ خیال	رئیس احمد جعفری	۴ — ۳
چاندنی	رئیس احمد جعفری	۰ — ۴
ہچکولے	رئیس احمد جعفری	۰ — ۴
طوفان	رئیس احمد جعفری	۸ — ۳
سیما	رئیس احمد جعفری	۰ — ۴
عشق	رئیس احمد جعفری	۸ — ۴
اندھیر	قیصر ایوب	۱۲ — ۲
فریبِ ہستی (جاسوسی ناول)	منشی تیرتھ رام فیروزپوری	۰ — ۵

یہ کہہ کر میں بستر پر لیٹ گیا، تسنیم نے لاکھ لاکھ اصرار کیا، لیکن میں ایک لقمہ بھی نہ کھا سکا، شیریں کی معصوم و مظلوم صورت میری آنکھوں میں پھر رہی تھی، سچ تو یہ ہے کہ وہ معصوم بھی تھی، مظلوم بھی،

رات کو بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، تسنیم کے ڈر سے بظاہر سو رہا تھا، لیکن حقیقتاً جاگ رہا تھا، شیریں کے خیال سے دل پر ایک گھونسہ سا لگتا تھا، میں اسے مظلوم سمجھتا تھا، اور میرا دل کہتا تھا، تو نے ظلم کیا اس پر، دل اپنے فیصلہ پر قائم تھا، کوئی صفائی نہیں قبول کی اس نے، میں نے اس کے سامنے ندامت کی گردن جھکا لی، اور اعتراف خطا کر کے خاموش ہو رہا، بڑی دیر کے بعد نیند آئی، اور میں سو گیا خواب میں بھی بار بار شیریں میرے سامنے آتی رہی، صبح میں دیر میں سو کر اٹھا تسنیم ناشتہ کر چکی تھی، اس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "ناشتہ کر لیجئے پھر سو جائیے گا؟"

اب میرا دل ہلکا ہو چکا تھا، غم کا اثر دور ہو رہا تھا تسنیم کی دنیا میں غم کا کیا سروکار؟ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اٹھ بیٹھا بستر سے ناشتہ کیا اور دفتر چلا گیا، دو چار روز طبیعت ذرا مضمحل رہی، لیکن پھر آ گئی اپنی راہ پر تسنیم نہ ہوتی، تو شاید میں اس غم سے دیوانہ ہو جاتا، لیکن اس کا وجود ہر غم کا بہترین علاج ہے!

ختم

طنزیہ و مزاحیہ

تکونا دیس	ابراہیم جلیس	۲-۰
مخنوعہ لٹریچر	ابراہیم جلیس	۳-۰
چالیس کروڑ بھکاری	ابراہیم جلیس	۲-۱۲
کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں	ابراہیم جلیس	۲-۱۲
نکتہ چیں ہے غم دل	آغا افتخار حسین	۳-۴
آج کل کے رومان	خواتین کے افسانے	۲-۱۲
کسک	تسنیم سلیم چھتاری	۲-۱۴
غبار	قیسی رامپوری	۲-۱۲

نفسیات

شعور و لاشعور	علامہ موسیٰ مصری	۳-۴
نوجوانوں کی نفسیات	ڈاکٹر ریاض محمد عسکری	۳-۱۲
قوت ارادی	مترجمہ عبدالوہاب	۳-۰
نوجوانوں کی جنسی مشکلات	ڈاکٹر احمد عزت راجح	۳-۰
بچوں کی دیکھ بھال	مسلم ضیائی ایم اے	۴-۰
کامیاب جنسی زندگی	بدر شکیب	۳-۱۲
آپ بھی خوش رہیئے	اسلم چشتی	۴-۱۲
سوچئے اور زندگی سنوارئیے	غوث صدیقی ایم اے	۵-۰

فردوس	قیسی رامپوری	۱۲ — ۴
سزا	قیسی رامپوری	۱۲ — ۲
خطا	قیسی رامپوری	۴ — ۳
تحسین	قیسی رامپوری	۴ — ۳
انتقام	عابدی جعفر	۴ — ۴
عداوت ہی سہی	عابدی جعفر	۴ — ۴
میمونہ	عابدی جعفر	۴ — ۴
نیا فرہاد	عابدی جعفر	۸ — ۲
ایک بیوی ہزار عورتیں	عابدی جعفر	۴ — ۴
وفا کیسی ؟	عابدی جعفر	۴ — ۴
تیر نیم کش	خلیل احمد ایم اے	۰ — ۴
راگنی	محمد سلیم اللہ انصاری	۴ — ۴
رخشاں	سعیدہ مظہر ایم اے	۴ — ۳
ہما خانم	سجاد حیدر یلدرم	۱۲ — ۲
دلِ ناداں	ہادی حسین ایم اے	۱۲ — ۳
بے غیرت	یحییٰ صدیقی ایم اے	۱۲ — ۳
عشرت	عارف بٹالوی	۸ — ۲

اسلامی

اسلامی تربیت	امام غزالیؒ	۱۲ — ۳
حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی	علامہ مناظر احسن گیلانی	۱۲ — ۸
اسلام کی سیاسی تاریخ	ڈاکٹر ابن حسن پی ایچ ڈی	۱۲ — ۶
اسلام کا نظامِ حیات	عبدالوہاب خہوری	۴ — ۴
حکومتِ الٰہیہ	علامہ عبدالوہاب بیرسٹر	۱۲ — ۳
تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات	عبداللہ عنان بیرسٹر	۱۲ — ۳
اسلامی نظریہ اجتماع	حیدر زماں صدیقی	۱۲ — ۲
اسلام اور سود	ڈاکٹر انور اقبال قریشی	۸ — ۳
تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ	علامہ مناظر احسن گیلانی	۱۲ — ۳
تاجدارِ دو عالم	عبدالرحمٰن عزام بے	۱۲ — ۲
داستانِ کربلا	عبدالرحمٰن صدیقی	۰ — ۳
ذکرِ جمیل (نعتیہ کلام)	ماہر القادری	۸ — ۱
عالمگیر اسلامی تصورات	احمد فتحی زاغلول	۴ — ۳
مکاتیب امام غزالی	احمد غزالی	۰ — ۳
مقالات جمال الدین افغانی	مبارز الدین ایم۔ اے	۴ — ۳
مقام جمال الدین افغانی	رفعت ایم ۔ اے	۴ — ۳

ادب — تاریخ — تنقید — فلسفہ

نام کتاب	مصنف	آنے - روپے
فلسفۂ عجم	علامہ اقبال	۲ — ۳
تصورات اقبال	شاغل فخری	۶ — ۳
قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم	سوانح غلام محمد بی۔ اے	۱۴ — ۲
سیر افغانستان	سید سلیمان ندوی	۸ — ۲
فکر فرنگ	آغا افتخار حسین	۸ — ۲
فلسفیوں کے خواب	علامہ موسیٰ مصری	۸ — ۲
فلسفۂ امن	احمد حسن نقوی	۸ — ۲
کرنل لارنس	بشیر حسین	۱۲ — ۲
کوہ نور کی سرگزشت	رہبر فاروقی	۴ — ۱
نثرِ ریاض خیرآبادی	دلچسپ مضامین ریاض	۸ — ۲
جگر مرادآبادی	حالات انتخاب کلام	۱۰ — ۲
سہیل کی سرگزشت	رشید احمد صدیقی	۱۲ — ۳
زہریلے آنسو	قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ	۱۰ — ۲

فاتح چین (قتیبہ بن مسلم)	عثمان عماد بی۔ اے		۱۲ر
فاتح اسپین (حضرت عمر بن العاص)	〃 〃		۱۲ر

مشاہیر خواتین

حضرت عائشہ صدیقہؓ	۱۰ر	حضرت سیدہ فاطمہؓ	۷ر
حضرت خدیجۃ الکبریٰ	۷ر	حکمراں عورتیں	۸ر
محب وطن عورتیں	۸ر	چاند بی بی	۷ر
رضیہ سلطانہ	۷ر	ممتاز محل	۷ر

بڑے لوگ

حضرت علامہ اقبال	۷ر	قائدِ اعظم محمد علی جناح	۷ر
مہاتما گاندھی	۷ر	جواہر لال نہرو	۷ر
رئیس الاحرار محمد علی مرحوم	۷ر	سبھاش چندر بوس	۷ر
ٹیگور	۷ر	آن بان والے	۵ر
دونوں جہان والے	۷ر	اونچے نشان والے	۷ر
ٹیپو سلطان	۷ر	محمود غزنوی	۱۰ر

مشاہیرِ اسلام

سیرت آنحضرت صلعم	غلام محمد بی اے	۱۰/
حضرت ابوبکر صدیق رضؓ	الطاف شوکت بی۔اے	۷/
حضرت عمر فاروق رضؓ	" " "	۷/
حضرت عثمان غنی رضؓ	اعجاز الحق قدوسی	۱۰/
حضرت علی کرم اللہ وجہ	" " "	۱۰/
حضرت امام حسنؓ	عبدالصمد ہاشمی مولوی فاضل	۸/
حضرت امام حسینؓ	" " "	۱۰/
حضرت بلال رضؓ	شاہین فاروقی بی۔اے	۷/
حضرت خالد بن ولید رضؓ	" " "	۷/
حضرت محمد بن قاسم رضؓ	" " "	۷/
حضرت امام ابوحنیفہ رضؓ	" " "	۱۰/
حضرت ابوذر غفاریؓ	عثمان عمادی بی۔اے	۱۰/
حضرت امیر معاویہ رضؓ	مرزا شبیر بیگ	۷/
حضرت شاہ ولی اللہ رضؓ	" "	۷/
حضرت اسمٰعیل شہید رضؓ	" "	۷/
حضرت مجدد الف ثانی رضؓ	" "	۷/
فاتح اندلس (موسیٰ بن نصیرؒ)	سعید الحق عمادی	۱۲/

کہانیاں

خوفناک درندہ	۷ر	جادو کی دیا سلائی	۵ر
بہادر شہزادی	۷ر	سفید بلی	۱۰ر
خلیفہ سارس	۷ر	ٹامی کی کہانی	۱۰ر
لالچی گڈریہ	۷ر	دیس دیس کی کہانیاں	۷ر
بہادر سپاہی	۷ر	کانا باتی	۵ر
مصطفےٰ کی بہادری	۷ر	لاہور کی یادگاریں	۷ر
چڑی مار	۷ر	مشہور یادگاریں	۷ر
ایک جن اور طالب علم	۷ر	سگریٹ کانفرنس	۷ر
عجیب کہانی	۷ر	میجر حمید	۷ر
بے زبانوں کی کہانیاں	۷ر	شہزادی نجمہ	۷ر
جانوروں کی کہانیاں	۵ر	لال جوتیاں	۶ر
موتیوں کا انڈا	۷ر	سکندر	۶ر
ہیروں کی کان	۱۰ر	شہزادی زرتاج	۷ر
چالاک بھیڑیا	۱۰ر	اسلامی انصاف کی کہانیاں	۷ر
چوہوں کی بستی	۷ر	جادو کی کہانیاں	۹ر
سوتیلی بہن	۵ر		

ملنے کا پتہ

نفیس اکیڈمی

بلاسس اسٹریٹ کراچی نمبر ۲